قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

کا

تینتیسواں و چونتیسواں وعظ مسمّٰی بہ

ملت ابراہیم

و

العبادۃ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم العالی

حسب فرمائش جناب عبد الرحمن صاحب زمیندار رنگون (برہما)

بابت ماہ ذیقعدہ و ذوالحجہ سنہ ۱۳۴۲ ہجری

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون کے اہتمام سے چھپا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

نام وعظ	مقام وعظ	تاریخ و یوم	وقت	تعداد سامعین	
ملت ابراہیم	[illegible] رنگون	[illegible]	[illegible]	زائد از دو ہزار	

(خطبہ ماثورہ) فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ ومن یرغب عن ملة ابراہیم الا من سفہ نفسہ ولقد اصطفیناہ فی الدنیا وانہ فی الاخرة لمن الصالحین ۰ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین

جو آیت کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اسمیں ایک خاص مضمون مذکور ہے جسکو باقتضائے وقت بیان کے لئے اختیار کیا گیا ہے اور وہ مقتضائے وقت یہ ہے کہ یہ تو سب حضرات کو معلوم ہے کہ رنگون میں میرے حاضر ہونے کا یہ سب سے پہلا موقع ہے اس سے قبل نہ میرا یہاں کوئی بیان ہوا نہ یہاں میرے حاضر ہونے کا کبھی اتفاق ہوا اور جب حاضری ہی کا اتفاق نہیں ہوا تو موقع بیان کا تو کیا ملتا۔ تو گویا یہ اول بیان ہے میرا اس مقام پر۔ اس لئے جی یوں چاہتا ہے کہ ایسے مضمون کے متعلق بیان کیا جائے جو سب میں اولیت کا استحقاق رکھتا ہو اور یہ تو ظاہر بات ہے کہ ہم لوگوں کی حالت کے مناسب بیان ہے تو دین ہی کا ہے تو دین کے اجزا میں جو سب سے اول اور مقدم جزو ہو اسکو اس وقت بیان کرنا زیادہ زیبا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ دین میں اجزا مختلف ہیں یعنی کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع۔ اور یہ بھی سبکو معلوم ہے کہ اصول ہمیشہ قابل تقدیم ہوا کرتے ہیں اور مقدم ہوا کرتے ہیں فروع پر۔ یہ بات بھی سبکو معلوم ہے۔ اسکے علاوہ ایک تیسری بات اور بھی ہے جو سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ

کہ خود اصول میں بھی دو درجے ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو اصول اور ایک اصل الاصول تو ضرور ہوا کہ دین کے اندر بھی سب قسم کے اجزا ہوں بعض تو فروع کہنے کے قابل اور بعض اصول کہنے کے قابل پھر حسب قاعدہ مذکورہ جو اجزا اصول کہنے کے قابل ہوں اُن میں بھی ایک نہ ایک ایسی چیز ہونی چاہیے جو اُن اصول کی بھی اصل ہو اور جسکو اصل الاصول کہہ سکیں۔ اب رہی اسکی تعیین سو ہر شخص کو معلوم ہے کہ دین کے اندر اصل الاصول کیا چیز ہے ظاہر بات ہے کہ وہ ایسی چیز ہوگی جس کے مقابلہ میں نہ کوئی اصل معتد بہ درجہ رکھتی ہو نہ کوئی فرع یہ سب مقدمات بالکل ظاہر ہیں۔ اسکے بعد میں اپنے مسلمان بھائیوں کے فقط ایک اجماعی عقیدہ کو نقل کیے دیتا ہوں۔ اُس سے خود تعیین اُس اصل الاصول کی ہو جائیگی۔ یہ عقیدہ اجماعی ہے اور منصوص ہے اور منصوص بھی نص قطعی کہ بدون اسلام کے کوئی طاعت مقبول نہیں جب طاعت پر مقبولیت ہی مرتب نہ ہوئی تو وہ کوئی چیز معتد بہ نہوئی۔ اسکو سب مسلمان مانتے ہیں کسی سے خلاف وارد نہیں اور اگر کوئی خلاف کرے بھی تو وہ مسلمان نہیں کیونکہ نص قطعی کا انکار ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اسکی تصریح فرما دی ہے ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ اس آیت میں تو صاف نفی کر دی ہے دوسرے ادیان کے مقبول ہونے کی۔ دوسری آیت میں گو عنوان مختلف ہے لیکن مضمون یہی ہے ارشاد ہے ان الدین عند اللہ الاسلام حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک دین فقط اسلام ہے اسمیں بھی نفی ہے دیگر ادیان کی صحت کی۔ اسکے علاوہ جا بجا جہاں اعمال کے نافع ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ قیدیں بھی مذکور ہیں وھو مومن وھو محسن یہ قیدیں تصریحاً ظاہر کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بدون اسلام کے کوئی عمل مقبول نہیں۔ کوئی کتنا ہی بڑا عمل کرے لیکن مسلمان نہو تو وہ عمل کچھ بھی نہیں۔ کوئی لاکھ مجاہدے ریاضت کرے مگر مسلمان نہو تو کوئی معتد بہ نتیجہ نہیں کیونکہ اسکی عبادت کے اندر کوئی مقبولیت نہیں چنانچہ خود حق تعالیٰ جل جلالہ و عم نوالہ ایسوں کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعملون غرض یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ اہل عقل خوب سمجھتے ہیں کہ کسی شخص میں اگر سلطنت وقتیہ کی اطاعت نہو تو

اسکے سارے کمالات بالکل گرد اور ہیچ ہیں۔ بس اسی کے درجہ میں یہ امر ہے جو میں عرض کر رہا
ہوں۔ ہرچند اس مثال کی کوئی ضرورت اور حاجت نہ تھی کیونکہ مثال توضیح کے لئے ہوا کرتی ہے
سو اس مسئلہ میں کونسا خفا تھا جو اسکی توضیح کے لئے اس مثال کی ضرورت واقع ہوئی۔ مگر
ضرورت اس مثال کی یہ ہوئی کہ آج کل کچھ ایسا مذاق بگڑا ہے کہ ایسی موٹی بات میں بھی شبہ
پیدا ہونے لگا ہے جو عقیدہ کے درجہ میں گو نہ ہو لیکن رائے کے درجہ میں ضرور ہے وہ شبہ
مجھے اس وقت یاد آگیا اور وہ شبہ ہی محرک ہوا اسکا کہ اس مثال سے اسکو رفع کیا جائے بعض
خطوط میرے پاس آئے تو ان میں یہ شبہ پیش کیا گیا تھا کہ صاحب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان نہیں
انمیں گو سارے کمالات موجود ہوں لیکن اسکو نجات نہ ہوگی۔ تو بعض مدعیان عقل نے یہ شبہ
پیش کیا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص میں تمام کمالات موجود ہیں سخاوت بھی مروت بھی
ایثار بھی قومی ہمدردی بھی۔ آج کل بس یہ اخلاق شمار کئے جاتے ہیں اور آج کل بڑی تہذیب
ان اخلاق ہی کو سمجھا جاتا ہے اور عقائد کو عقیدۃً تو نہیں لیکن حالاً دائرہ مفہوم تہذیب سے
گویا خارج ہی کر دیا ہے بلکہ عقائد کے اندر تو اپنے آپ کو بالکل مختار ہی سمجھ لیا ہے سمجھتے ہیں کہ
عقیدہ تو محض خیال کا نام ہے۔ اور خیال کو بھلا کیا دخل نجات میں۔ عقائد کو تو یوں غیر ضروری
قرار دے لیا ہے اعمال سو اعمال کو کسی درجہ میں ضرور مؤثر سمجھتے ہیں مگر ان میں بھی سب اعمال
نہیں محض چند اعمال جنکا نام اخلاق رکھ لیا ہے اور انہیں کو مدار ٹھیرا دیا ہے ترقی اور کمال کا اور
ان ہی اخلاق کا نام تہذیب رکھا ہے۔ اور ان کے یہ نام ہیں ترحم ایثار ہمدردی نفع رسانی
حب قومی بس ان چند اخلاق میں تہذیب کو منحصر سمجھکر یہ شبہ پیش کر دیا کہ ایک شخص سب
بزرگوں کی تعظیم تکریم بھی کرتا ہے کسی نبی کی اہانت بھی نہیں کرتا کسی کا دل بھی نہیں دکھاتا
داد و دہش بھی کرتا ہے۔ مگر فقط رسالت کا منکر ہے گو رسول کی بے ادبی بھی نہیں کرتا۔ اور خدا
کو بھی مانتا ہے یا خدا کو بھی نہیں مانتا تو یہ کہا جائیگا کہ صرف دو مفروض کمالات نہیں ہیں پھر
سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ان دو مفروض کمالات کے نہ ہونے سے اسکے سارے کمالات
پر کیسے خاک ڈالدی جائیگی اور اسکو جہنم میں ٹھونس دیا جائیگا یہ تو بڑی بے رحمی کی بات ہے
اور شبہ کو اس سے قوی کرتے ہیں کہ اسکے مقابلہ میں ایک ایسا شخص ہے جو نہ حلال حرام کی

پروا کرتا ہے نہ فرائض کو ادا کرتا ہے۔ نہ نماز کا نہ روزہ کا بلکہ بڑے درجہ کا فاسق وفاجر اور بدکار غرض تمام اعمال اور اخلاق اسکے خراب مگر ہے مسلمان تو کہتے ہیں کہ صاحب چونکہ مسلمان ہے اسلئے کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور جائیگا خواہ کٹ کٹ کر ٹھیکرا ہی جائے مگر جائیگا ضرور۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا یوں اللہ ورسول برحق ہیں لیکن بظاہر یہ معاملہ خدا کی شان کے خلاف ہے یہ تو بالکل تعصب معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ شبہ پیش کرتے ہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کیسے افسوس کی بات ہے۔ یہ شبہ اُن لوگوں کی زبان اور قلم سے نکلتا ہے جو اپنے کو سچا اور پکا مسلمان بلکہ قوم کا لیڈر اور مصلح خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ شبہات پیش کرتے ہیں۔ سو حضرت میں ان شبہات کا راز بتلا دوں۔ جو جاہل ہو کر اپنے کو محقق سمجھے گا وہ ایسی ہی خرابی میں پڑیگا۔ حضرت محققیت کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بہت بڑی چیز ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ ساری خرابی انکی دعوے محققیت کا نتیجہ ہے یعنی انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم محقق ہیں حالانکہ لوازم محققیت سے یہ سمجھنا بھی ہے کہ ہم محقق نہیں ہیں جب علم وکمال کے ساتھ یہ اعتقاد نہ رہے کہ ہم محقق ہیں تب کہیں جا کر انسان محقق ہوتا ہے۔ اگر یہ لازم منتفی ہے تو محقق شدن بھی منتفی ہے۔ چاہے عالم فاضل ہی کیوں نہو۔ اور چہ جائیکہ عالم فاضل بھی نہو چنانچہ آج کل جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں انکا مبلغ علم بھی تو کچھ نہیں بس کچھ تاریخیں پڑھ لیں کچھ فلسفہ پڑھ لیا اور سمجھنے لگے کہ ہم بہت بڑے محقق ہیں جب اپنے نزدیک محقق ہو گئے تو پھر یہ خیال غالب ہو گیا کہ جو ہماری رائے کے خلاف ہے وہ واقع اور تحقیق کے بھی خلاف ہے چنانچہ جو چاہا شبہ پیش کر دیا۔ چنانچہ یہ بھی ایک شبہ پیش کر دیا جو میں نے عرض کیا میں نے اسلئے اس مثال کی ضرورت سمجھی کہ یہ شبہ رفع ہو جائے ورنہ فی نفسہ یہ مسئلہ بالکل صاف تھا اور محتاج مثال نہ تھا۔ تقریر یہ ہے اس مثال کے انطباق کی کہ میں صاحب اعتراض اور صاحب شبہ سے گورنمنٹ کا قانون پوچھتا ہوں کہ ایک شخص ہو نہایت لائق جسکو تمام کمالات اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے حاصل ہوں مگر باغی ہو یعنی سلطنت کی اطاعت نکرتا ہو اسکی کیا سزا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسکی سزا پھانسی ہے یا عبور دریائے شور یا حبس دوام اب ایک شخص ایسے مجرم کے مقدمہ کی پیشی کے وقت عدالت میں حاضر ہے جج صاحب نے

سزائے حبس دوام کا حکم سنایا۔ آپ نے سنا۔ سنکر آپنے پوچھا۔ کیوں صاحب اسپر کیا الزام لگایا گیا ہے اور کونسی دفعہ قائم کیگئی ہے جو اسقدر سخت سزا تجویز کیگئی۔ جج صاحب نے کہدیا اس نے بغاوت کا جرم کیا ہے اسلیئے اسکو حبس دوام کی سزا دیگئی ہے یہ سنکر آپ کیا فرماتے ہیں کہ حضور کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص ایم اے ہے ایل ایل بی ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیئے ہوئے ہے انگریزی ایسی جانتا ہے کہ انگریز بھی نہیں جانتے۔ جج صاحب نے کہا ہاں معلوم ہے۔ پھر کہا حضور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص سائنس کا بھی بڑا ماہر ہے اس نے وہ وہ صنعتیں ایجاد کی ہیں کہ اہل یورپ بھی دنگ ہیں۔ کہا ہاں سب معلوم ہے۔ کہا پھر بڑے ہی غضب کی بات ہے اور بڑی بے انصافی ہے کہ اسکی ساری لیاقتیں پس پشت ڈالدی گئیں اور ساری قابلیتیں خاک میں ملادی گئیں فقط اتنی سی بات پر کہ باغی ہے حبس دوام کی سزا دیدی گئی۔ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ جج کے اس حکم پر کبھی وسوسہ بھی ذہن میں نہ آئیگا کہ ایسی سخت سزا انصاف کے خلاف ہے یا ترحم کے خلاف ہے۔ کیونکہ سمجھ لوگے کہ بغاوت جرم ہی ایسا ہے جسکی یہی سزا ہونی چاہیے۔ اگر اس صاحب شبہ کو جج کے فیصلہ پر بھی وسوسہ آتا تو خیر یہ کہا جاسکتا تھا کہ بیچارہ کیا کرے اسکی سمجھ ہی موٹی ہے اسلیئے جو وسوسہ خدا پر پہونچا وہی جج پر بھی پہونچا۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ جج کے فیصلہ پر تو کبھی وسوسہ نہ آیا اور خدا نے جو اُسی کے مثل فیصلہ فرمایا اس پر شبہ پیش کردیا۔ پھر اے صاحبو یہ کیسا ایمان ہے اور یہ کیسا اسلام ہے کہ اس شخص کے نزدیک جج کا فیصلہ تو عقل کے قریب۔ اور خدا کا فیصلہ عقل سے بعید۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک شخص سلطنت سے بغاوت کرے تو اسکے سارے اعمال اور اسکی ساری خوبیاں ضبط ہونا تو معقول اور جو خدا سے بغاوت کرے اُسپر شبہ اور اس شبہ کے جواب کے بعد ایک شبہ اور کیا جایا کرتا ہے کہ خیر یہ تو سمجھ میں آگیا کہ اگر خدا سے بغاوت کرے تو واقعی اسکے سارے اعمال حبط ہی ہوجانے چاہئیں لیکن اگر کوئی خدا کو بھی مانتا ہو مگر صرف رسول کو نہ مانتا ہو تب تو اعمال کے حبط ہوجانے کی کوئی وجہ ہی نہیں معلوم ہوتی اور اس شبہ میں بہت سے لوگ مبتلا پائے گئے کہ وہ انکار رسالت کو کفر نہیں سمجھتے میں کہتا

ہوں کہ اول تو نصوص قطعیہ اس کی تکذیب کرتی ہیں اور جن نصوص سے یہ شبہ واقع ہوا ہی اُن کی صحیح تفسیر ان لوگوں نے نہیں سمجھی یہ تو کلام ہے نقل و تحقیق کی حیثیت باقی عقل و الزام کی حیثیت سے یہ جواب ہے کہ جو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو نہیں مانتا وہ واقع میں خدا کو بھی نہیں مانتا۔ اور مان بھی نہیں سکتا۔ اسکو یوں سمجھئے کہ خدا کے ماننے کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کو ماننا اُسے کہتے ہیں کہ جیسا خدا ہو ویسا ہی اُسے اعتقاد کرے۔ اگر کسی نے اور طرح کا مان لیا تو اُس نے خدا کو نہیں مانا بلکہ اپنے خیال کو مانا مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں بادشاہ کو مانتا ہوں۔ اور کوئی پوچھے کہ خبر بھی ہے بادشاہ کیسا ہے اور وہ کہے کہ اُسکے ایک آنکھ ہے ایک ٹانگ ہے ہاتھ دونوں کٹے ہوئے ہیں حالانکہ دراصل بادشاہ بہت حسین و جمیل ہے اور اُس میں کوئی نقص یا عیب نہیں ہے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ اُس نے بادشاہ کو مانا۔ بادشاہ کو کہاں مانا۔ بادشاہ تو نہایت حسین و جمیل ہے اور سب نقائص سے پاک ہے۔ اُس نے تو اپنے خیال سے ایک نیا بادشاہ تصنیف کر لیا ہے اُسکو مانا ہے تو خدا کے ماننے کے یہ معنی ہیں کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی اُسے مانے یعنی تمام کمالات کے وجود کا اُس میں اعتقاد رکھے۔ اور چونکہ منجملہ کمالات کے ایک کمال سچا ہونا بھی ہے اسلئے اگر خدا کو سچا نہ مانے تو یہ بھی خدا کا نہ ماننا ہی ہوا بلکہ انکار ہی ہوا۔ جب یہ مقدمہ سمجھ میں آگیا تو اب یہ دیکھئے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لہذا جب رسول کی رسالت کا انکار کیا تو خدا کو جھوٹا سمجھا اور اُسکے ایک کمال کا انکار کیا یعنی سچے ہونیکا۔ ان سب مقدمات سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ جب کسی نے رسول کو نہ مانا تو وہ خدا سے باغی ہوا۔ اور اُسکو تسلیم ہی کر لیا گیا ہے کہ جس نے خدا سے بغاوت کی وہ مستحق ہے عذاب ابدی کا۔ تو صاحبو رسول سے باغی ہونا مستلزم ہے خدا سے باغی ہونیکو اور اُسکا جرم عظیم ہونا اوپر مذکور ہو چکا ہے اسی طرح غیر باغی مجرموں کی سزا میں یہ اعتراض اور وسوسہ بھی کسی کو نہیں ہوتا کہ صاحب فلانا مجرم تھا اُس نے جو اکھیلا اٹھایا ڈکیتی کی تھی یا چوری کی تھی۔ اُسکو بھی سزا تو دی مگر اُس کی برابر نہیں جس نے بغاوت کی تھی وہ برس کی قید بھگت کر پھر رہا ہو گیا اور پھر آکر اپنے بیوی بچوں کی صورت دیکھ لی۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا

کہ ایسی کھلی ہوئی بدتہذیبی کے افعال کے مجرموں کے ساتھ تو ایسی نرمی برتی گئی جن کے اعمال اور اخلاق سب نہایت ناگفتہ بہ اور ایک شخص اتنا صاحب کمال اور ذی لیاقت و وجاہت اور اسکو سزائے حبس دوام دیدی گئی اور دوسرے مجرموں کو بھی قید کی سزا تو دیگئی لیکن انکی سزائیں ایک ایسی میعاد بھی ہو جسکے بعد رہائی ہو جائیگی لیکن یہ بیچارہ باغی کبھی رہا ہی نہوگا ساری عمر جیل خانہ ہی میں گذریگی ہمیشہ کیلئے اپنے دوست احباب بیوی بچوں سے جدا کر دیا گیا بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے سو یہ شبہ کسی کو نہیں ہوتا اگر کسی کو یہ شبہ ہو بھی اور جج سے کوئی یہ سوال بھی کرے تو وہ کیا کہیگا یہی کہیگا کہ ان دونوں میں فرق ہے ایک گو قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے مگر صاحب قانون کی حکومت کو تو تسلیم کئے ہوئے ہے یعنی گورنمنٹ سے تو بغاوت نہیں کرتا اور دوسرا تو سرے سے گورنمنٹ ہی کو اڑانا چاہتا ہے گورنمنٹ کو گورنمنٹ ہی تسلیم نہیں کرتا۔ تو اس دوسرے شخص کا جرم کسی طرح قابل معافی ہے ہی نہیں کیونکہ یہ تو گورنمنٹ کے وجود ہی کو مٹانیکی فکر میں ہے اور پہلا شخص گو قانون کے خلاف کرتا ہے مگر صاحب قانون کو تو مٹانا نہیں چاہتا بس وہ یہی جواب دیگا اب میں پوچھتا ہوں کہ اسکا یہ جواب معقول ہے یا نہیں یعنی ہمارے معترضین کے نزدیک بھی معقول ہے یا نہیں۔ ضرور معقول ہوگا کیونکہ سراسر اُن کی عقل کے موافق ہے تو حیرت کی بات ہے کہ ایک جواب جج صاحب کے منہ سے نکلے تو وہ معقول اور وہی جواب مولویوں کے منہ سے نکلے تو وہ تشدد ہے تعصب ہے غلو ہے بس نہ معلوم مولوی ہونا جرم ہے کہ جو انکے منہ سے نکلے اُسے ضرور جھٹلانا خواہ وہ کیسے ہی ٹھکانے کی بات کہیں اور اگر وہی بات کسی تعلیم یافتہ جدید کے منہ سے نکلے تو فوراً آمنّا و صدّقنا۔ میرے ایک مخدوم فارسی کے اُستاد اپنا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ کسی حاکم نے ایک فیصلہ کیا جو اتفاق سے عالمگیریہ کے ایک جزئیہ کے موافق تھا گو عالمگیریہ کے جزئیہ کے بنا پر نہیں تھا مولانا موصوف نے کسی واقعہ کے متعلق ایک مسئلہ کسی مجمع میں بیان فرمایا کہ عالمگیریہ میں اسکے متعلق یہ لکھا ہے۔ بڑے بڑے مدعیان عقل وہاں موجود تھے کسی نے التفات بھی نہ کیا۔ مولانا تھے بڑے ظریف۔ حاضرین سے فرمانے لگے کہ حال میں ایسے ہی واقعہ کے متعلق ایک مقدمہ ہوا ہے صاحب کلکٹر کے یہاں انھوں نے

بھی اسی کے موافق فیصلہ کیا ہے یہ سنتے ہی سب چونکتے ہو گئے۔ اور اصرار شروع ہوا کہ ہاں صاحب ذرا فرمایئے تو کہ کلکٹر صاحب نے کیا فیصلہ کیا۔ مولانا نے وہ فیصلہ بیان کیا جو کہ عالمگیریہ کے اس جزئیہ کے موافق تھا جسکو مولانا اس سے قبل بیان فرما رہے تھے اور کوئی التفات بھی نہ کرتا تھا۔ سب نے سنکر تسلیم کیا۔ انھوں نے کہا کہ جناب یہ وہی تو بات ہے جو عالمگیریہ میں لکھی ہوئی ہے مگر عالمگیریہ جیسے معتبرہ تھی اور اب انگریزی فیصلہ کی موافقت سے معتبر ہو گئی۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے۔ صاحبو یہ تو حال ہے اور پھر کہتے ہیں کہ ہم لوگ مومن ہیں ہم مسلمان ہیں۔ یہ کیا ایمان ہے اور کیا اسلام ہے تو اس مذاق کے بھی لوگ اس زمانہ میں کثرت سے موجود ہیں اسلئے میں نے یہ مثال عرض کی تھی کہ اسلام کا مدار نجات ہونا ایسا ہی ہے جیسے سلطنت کا فرمانبردار ہونا مقبولیت کا مستحق بننا ہے اور اگر ایسا شخص مجرم بھی ہے تو اپنے جرموں کی سزا بھگت بھگتا کر انجام کار برات حاصل کر سکتا ہے یا بے سزا پائے ہی محض بطور مراحم خسروانہ کے بری کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف باغی کے جسکی سزا کے منقطع ہونیکی کوئی صورت ہی نہیں بجز تصدیق حکومت و اطاعت اور اعلانِ وفاداری کے۔ اب اس عقیدہ کو دیگر عقائد سے ملایا جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ اگر کسی عقیدہ کا اصل الاصول نام ہونا زیبا ہے تو وہ فقط اسلام ہے۔ تو اسلام کو اسطرح اولیت اور تقدم کا حق حاصل ہے اور چونکہ اس مقام پر یہ میرا اول بیان ہے اسلئے پہلے اول الاعمال ہی کا بیان کرنا زیادہ مناسب ہوا۔ یہ جو کچھ میں نے ابتک اسلام کی بابت بیان کیا ہے یہ تو علم و عقیدہ کے متعلق ہے جسمیں بفضلہ اکثر مسلمان غلطی سے محفوظ ہیں اور جو غلطی اسکے متعلق نو تعلیمیافتہ حضرات کرتے ہیں اسکو الحمدللہ بوجہ احسن رفع بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام کی بابت ہم لوگوں نے ایک عملی غلطی بھی کی ہے اسوقت زیادہ تر اسکا رفع کرنا مقصود ہے۔ وہ عملی غلطی یہ ہے کہ ہم سب کے سب اسکے معتقد ہیں کہ ہم مسلمان ہیں صاحب اسلام ہیں اور بحمد اللہ یہ اعتقاد ایک حد تک سچا بھی ہے۔ مگر ایسا ہی سچا ہے جیسا کہ میں ایک مثال کے ضمن میں عرض کرتا ہوں۔ اے صاحبو کیا کہا جائے ہزاروں غلطیوں میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بالعاد کا ایک لفظ ہے اسکو ذہن میں محفوظ رکھو پھر سے

سوالات کا جواب دیجئے۔ فرض کیجئے کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے کسی کے پاس پانچ ہزار ہے کسی کے پاس پانچ لاکھ ہے کسی کے پاس ایک لاکھ ہے کسی کے پاس پچاس ہزار ہے وعلیٰ ہذا اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ ان میں سے کسکو مالدار کہیں گے اور کسکو نہیں۔ آپ ضرور ہر ایک کی بابت یہی کہیں گے کہ علیٰ قدر مراتب یہ سب مالدار ہیں۔ اور اگر آپ سے پوچھا جائے کہ سو روپیہ کے مالک کو بھی آپ مالدار سمجھیں گے یا نہیں تو آپ کہیں گے کہ ہاں یہ بھی ایک درجہ مالدار ہونیکا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس صرف پچاس ہی روپیہ ہیں تو اسکے متعلق بھی آپ کہدینگے کہ ہاں یہ بھی کچھ درجہ کہا جاسکتا ہے یہانتک کہ اگر ایک پیسہ والے کے بارہ میں آپ سے یہی سوال کیا جائے کہ وہ بھی مالدار کہا جاسکتا ہے یا نہیں تو آپ پوچھنے والے پر ہنسیں گے کہ آپ بھی عجب عقلمند ہیں۔ کہیں ایک پیسہ کے مالک کو بھی مالدار کہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی مال میں مال ہے۔ مگر حضرت میں پوچھتا ہوں کہ مال کہتے ہیں کسکو۔ مال کی تعریف آخر یہی تو ہے عین ینتفع بہ یعنی جس عین سے یا یوں کہیئے جس جوہر سے یا یوں کہیئے جس ذات سے کوئی نفع حاصل کیا جاسکے پھر میں کہتا ہوں ایک پیسہ سے بھی تو نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک پیسہ کا تیل لیکر ڈبیہ میں ڈالدو پھر دیکھو رات بھر گھر میں کیسا اُجالا رہتا ہے۔ تو کیوں صاحب جب اس پیسہ پر مال کی تعریف صادق آتی ہے تو اسکے مالک کو مالدار کیوں نہ کہا جائیگا۔ آپ اسکے جواب میں یہی کہیں گے کہ بھائی مالدار تو اسی کو کہیں گے جسکو قابلِ اعتبار درجہ مال کا حاصل ہو۔ اگر ایک پیسہ والا بھی اپنے کو مالدار کہے یا سمجھے تو شرم کی بات ہے۔ اُسکا اپنے آپ کو مالدار کہنا گو لغۃً صحیح ہے مگر معتدبہ مالدار تو اُسی کو کہتے ہیں جسکے پاس معتدبہ مقدار مال کی ہو۔ خلاصہ یہ کہ معتدبہ مقدار کے مالک کو مالدار کہتے ہیں۔ غرض یہاں تو آپنے یہ منطق سیکھ لی کہ مطلق کو اُسکے اطلاق پر نہ رکھا بلکہ اُسکو مقید کیا ایک مقدارِ خاص کے ساتھ۔ اُس مقدار تک پہونچنے سے قبل اُسکو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اُسکو مالدار کہیں۔ سو یہاں تو آپنے یہ منطق یاد کر رکھی ہے اور اسی کی نظیر میں آپ ہم سے اُلجھتے ہیں۔ بس ایک کلمہ پڑھکر دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کہتے ہیں کہ آخر مسلمان کہتے کسکو ہیں۔ اسی کو نا جسکے پاس اسلام ہو سو ہم کلمہ گو ہیں ہی اسلیے

ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ہاں مسلمان وہی ہے جسکے پاس اسلام ہو لیکن کیسا اور کس درجہ کا اسلام ہو۔ آیا کوئی خاص درجہ اسلام کا مراد ہے یا کسی درجہ کا ہو۔ آپ کے نزدیک کافی ہے۔ کچھ خبر بھی ہے اسکے درجات کتنے ہیں۔ حضرت اسکے بہت سے درجات ہیں جنمیں سے اسوقت صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جنکو سب مانتے ہیں۔ ایک ادنیٰ درجہ ایک اعلیٰ درجہ ادنیٰ درجہ اسلام کا کسے کہتے ہیں۔ اُسے کہتے ہیں کہ جسکے بدون مسلمان ہی نہ کہا جاسکے اور وہ کونسا ہے۔ وہ اسکا قائل ہونا اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و اشهد ان محمدا عبده ورسوله (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کوئی اسکا بھی قائل نہو تو وہ کافر ہے۔ یہ تو گویا ادنیٰ درجہ ہوا اسلام کا۔ اب آگے اُسکی تکمیل ہوتی ہے نماز سے روزہ سے کثرت ذکر سے خشیت سے معرفت سے صبر سے توکل سے اخلاص سے وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ سب مکمل ہیں اسلام کے۔ یہ اسلام کا اعلیٰ درجہ ہوا۔ تو یہ دونوں درجے اسلام کے وہ ہیں جنکو سب مانتے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ہمارا آپکا اسلام کون سے درجہ کا ہے اسپر شاید کوئی شیخی باز کہنے لگے کہ جو کامل الاسلام سمجھے جاتے ہیں وہی کون سے تیر چلا رہے ہیں ان میں ہم سے زیادہ کیا چیز ہے۔ یہی نماز روزہ وہ بھی کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں پھر ہم سے کس درجہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مگر حضرت آپ میں کس میں اور ہم میں ان میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے پاس تو محض صورت ہے نماز روزہ کی معنی ہیں نہیں اور اسمیں میں اپنے آپکو بھی داخل کرتا ہوں۔ قطع نظر تواضع سے۔ کیونکہ یہ موقع تواضع کا نہیں ہے اسوقت تو بیان واقع کا کیا جارہا ہے۔ غرض ہم لوگ ادنیٰ درجہ کے مسلمان ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اس ادنیٰ درجہ کے اسلام پر آخر آپ کیوں کفایت کرتے ہیں۔ آگے کا درجہ کیوں نہیں حاصل کرتے جیسا کہ مال کے ادنیٰ درجہ پر کوئی قناعت نہیں کرتا۔ یہاں پر آکر اپنی وہ منطق سب بھول گئے بلکہ ایک نئی منطق ایجاد کی ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب حدیث شریف میں آیا ہے من قال لا اله الا الله فدخل الجنة جس نے لا اله الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہو گیا سو اس درجہ کا اسلام ہمارے پاس ہے ہی۔ باقی ہم سے نماز روزہ کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ اجی جنت میں داخل ہونا ضروری چیز ہے سو حضور فرما ہی چکے ہیں کہ من قال لا اله الا الله دخل الجنة۔ میں کہتا ہوں کہ صرف دخل ہی فرمایا ہے یا یہ بھی فرمایا ہے کہ دخل دخولاً اولیاً یعنی فوراً جنت میں داخل

ہو جائیگا۔ حضور نے یہ فرمایا ہے کہ جنت میں جائیگا۔ لیکن کب جائیگا اسمیں تو دو احتمال ہیں ایک تو یہ کہ سزا کے قبل جائے۔ سو آپکو کیا حق ہے اسکی تعیین کا۔ کیا کوئی دلیل آپ کے پاس ہے اسکی دلیل تو کیا ہوتی بلکہ الٹی اسکے خلاف پر دلیل قائم ہے۔ حدیث میں شراب خوری پر سود لینے پر جھوٹ بولنے پر حقوق ضائع کرنے پر غیبت پر چغلخوری پر بدنظری وغیرہ پر سخت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ پھر آخر یہ حدیثیں کیا بیکار ہیں۔ یا نعوذ باللہ صحیح نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ وعیدیں جو حدیثوں میں آئی ہیں یہ بھی صحیح ہیں اور یہ حدیث بھی صحیح ہے من قال لا الہ الا اللہ فدخل الجنۃ۔ دونوں صحیح ہیں۔ کیونکہ دونوں حضور کی فرمودہ ہیں۔ لہذا میں دونوں کو جمع کرتا ہوں کیونکہ مخبر صادق کے کلام میں تعارض اور تناقض ہو نہیں سکتا تو لامحالہ وہ مضمون جنت میں داخل ہونیکا بھی ٹھیک ہے اور وہ دوزخ کی وعیدیں بھی صحیح ہیں۔ یہ دونوں قسم کی حدیثیں دو طرح صحیح ہو سکتی ہیں۔ یعنی عقلاً دو احتمال ہیں ایک صورت یہ کہ اول اپنے معاصی کی سزا پانے کیلئے دوزخ میں داخل کئے جائیں پھر ایمان کی وجہ سے وہاں سے نکالکر جنت میں داخل کر دئے جائیں۔ اور ایک صورت یہ کہ پہلے جنت میں داخل کئے جائیں پھر دوزخ میں لیکن اسکا تو کوئی قائل ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ تو نصوص قطعیہ سے منفی ہے کہ جنت میں پہونچا کر پھر وہاں سے نکالا جائے۔ ضرور دوسری شق کو متعین کیا جائیگا۔ اور وہی نصوص کے مطابق بھی ہے یعنی پہلے دوزخ میں سزا پاکر پھر جنت میں داخل کئے جائیں گے خواہ ایک دن کے بعد یا ہزار برس کے بعد یہ اللہ کو معلوم ہے اور وہاں کا تو ایک دن بھی یہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے تو ہزار برس تو کیا کچھ ہوگا چنانچہ ارشاد ہے وان یوما عند ربک کالف سنۃ مما تعدون یعنی ہمارے یہاں کا ایک دن تمہارے یہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے اگر وہاں ایک دن کی بھی حوالات ہوگئی تو یہاں کی ہزار برس کی قید کی برابر سمجھئے لیکن بہر حال میں کبھی نہ کبھی ختم تو ضرور ہوگا۔ مگر قبل جنت کے جو جہنم میں سزا ہوئی ہے کیا وہ ایسی ہی سزا ہے جیسی دنیا کی جسکے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسی ہی ہوتی تو خیر یہ کہہ سکتے تھے کہ چلو دوزخ ہی میں چند روز رہ آئیں گے۔ مگر اے صاحبو وہاں کی سزا کا کیا ٹھکانا ہے اللہ بچاوے۔ جن اعمال کو لذت کیلئے اختیار کیا تھا ان سے اس قدر لذت نہیں پہونچی جسقدر ان کی سزا کے اندر کلفت

ہو گی۔ میں کہتا ہوں کسی کی عمر بچاس ساٹھ برس کی ہوئی پھر اُس میں بھی جو انتفاع کے قابل
زمانہ ہوتا ہے وہ تو چند ہی ایام ہوتے ہیں۔ اور گناہ سے لذت اُٹھائیگی تو کچھ ساعتیں
ہی ہوتی ہیں اُسکے بعد کچھ بھی نہیں تو اسکے لئے ہزار برس کی قید جو کہ ادنیٰ درجہ کی ہے
گوارا کرنا کون عقل کی بات ہے۔ بہرحال اس حدیث من قال لا الٰہ الا اللہ دخل
الجنۃ سے تمسک کرنا بیفکری کے لئے کافی نہیں۔ یہ تو ایک عقیدہ کی تعلیم ہے کہ مومن
خلود فی النار سے محفوظ رہے گا۔ کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور داخل ہو گا۔ مگر یہ کہاں کہا گیا ہے
کہ اسکو اس طرح گناہوں کے کرنے میں استعمال کیا جائے۔ اس طرح سے جان جان کر اسکو
گناہوں کے کرنے میں استعمال کرنا یہ تو بڑی ہی ناشکری اور دلیری بلکہ گستاخی ہے خلاصہ
یہ کہ یہاں وہ منطق کہ ادنیٰ درجہ پر قناعت نہیں کی جاتی بھول گئے اور ادنیٰ درجہ کو اسلام
کو مسلمان بننے کے لئے کافی سمجھ لیا تو ایسے کو مسلمان کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک پیسہ کے
مالک کو مالدار کہنے لگیں۔ گو جیسے وہاں باعتبار اطلاق کے ایسے شخص پر مالدار ہونا صادق
آتا ہے اسی طرح یہاں بھی ایسے شخص پر مسلمان ہونا صادق آتا ہے مگر جیسا کہ وہاں اسپر
نظر ہے کہ جب معتدبہ مقدار مال کی نہوئی تو وہ کیا مال ہوا ایسے ہی یہاں نظر چاہئے کہ جب
معتدبہ درجہ اسلام کا نہ ہوا تو وہ کیا اسلام ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نے نفی مقدار معتدبہ
کو نفی ذات کی صورت میں تعبیر فرمایا چنانچہ ارشاد ہے من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد
کفر لیجئے اب بہت صاف معنی ہو گئے اس حدیث کے یعنی حضور فرماتے ہیں کہ جو نماز
جانکر چھوڑ دے وہ مسلمان نہ رہا۔ اسکی اور توجیہوں میں محض تکلف ہے۔ لیکن سیدھی تاویل
جو جمہور علمائے اہل سنت والجماعت کے مذہب کے موافق ہے وہ یہی ہے کہ حضور نے کمال
اسلام کی نفی کی ہے مطلق نفی اسلام مراد نہیں جمہور کی یہی توجیہ ہے۔ میں نے اسکو محاورات
میں تعبیر کر دیا ہے۔ اب اسکے معنی بالکل صاف ہو گئے کہ حضور نے اسکو ایسا ہی کافر فرمایا ہے
جیسے ہم پیسہ کے مالک کو غیر مالدار کہہ دیتے ہیں۔ گو فی نفسہ نہ وہ علی الاطلاق کافر ہے نہ یہ
علی الاطلاق غیر مالدار تو جیسے یہ حکم صحیح ہے اور اسمیں کسی کو شبہ نہیں ہوتا نہ کسی مولوی کو نہ
طالب علم کو نہ کسی فلسفی کو نہ عامی کو اسی طرح یہاں بھی نہ ہونا چاہیے تو معلوم ہوا کہ کمال اسلام

وہ چیز ہے جسکی نفی کو حضور نے نفی الاسلام سے تعبیر فرمایا تو صاحبو وہ درجہ اسلام کا ہمکو کیا خوش کر سکتا ہے جسکو نفی اسلام سے تعبیر کیا جا سکے اور واقعی کیا مسلمان ہیں کہ نہ نماز نہ روزہ نہ حج نہ زکوۃ اور کہنے کو مسلمان - مگر اس مسلمان نے یہ فتوی بھی حضور کا سنا کہ جو نماز کو عمداً ترک کرے وہ کافر ہو جاتا ہے حیرت ہے کہ ایسے اسلام سے کیونکر تسلی ہو جاتی ہے مگر مال کے اس درجہ سے تسلی نہیں ہوتی فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس اتنی مقدار مال کی تھی کہ وہ مالدار مشہور تھا - ایک دن اسکی عدم موجودگی میں کہیں گھر کے اندر چور گھس آئے اور جو کچھ اندوختہ تھا سب لیگئے صرف دو چار پیسہ جو اتفاق سے اسکی اچکن کی جیب میں تھے وہ تو پڑے رہے باقی سارا مال متاع جاتا رہا اب یہ وہ کبھی یہ نہ کہیگا کہ اجی کامل مالدار اگر نہ رہا نہ سہی کیا غم ہے کسی درجہ میں تو مالدار میں اب بھی ہوں ہی چنانچہ جیب میں چار پیسے موجود ہیں - وہاں کبھی جی کو تسلی نہیں ہوتی کہ چار پیسے تو موجود ہیں بلکہ اگر کوئی سمجھائے بھی کہ کیوں غم کرتے ہو بلا سے زیادہ مال نہ رہا - چار پیسے تو موجود ہیں ہی یہ بھی تو آخر ایک مقدار مال ہی کی ہے اور اسکے اعتبار سے اب بھی تم مالدار ہی ہو - تو کیا اس تقریر سے اسکی تسلی ہو جائیگی یا طیش میں آکر یہ کہیگا کہ آپ بھی عجب چیز ہیں - آپ کے نزدیک یہ مال ہوگا - بھلا چار پیسے بھی کوئی مال ہیں مال ہے - میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا بجز ان چار پیسوں کے - اور ان سے کیا خاک کام چلسکتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مال تسلی بخش نہیں ہے تو وہ اسلام کیوں کر تسلی بخش ہو گیا - آخر وجہ فرق کیا ہے - اسی کو مولانا غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا   وما اراهم رضوا فی العیش بالدون

یعنی میں دیکھتا ہوں امرا اور بادشاہوں کو کہ وہ ادنیٰ درجہ کا دین لیکر قناعت کرتے ہیں نماز پڑھنے لگے تو اپنے نزدیک بہت بڑے عابد زاہد ہو گئے - اور اگر کہیں کسی نے کچھ کتابیں بھی پڑھ لیں تب تو پھر کچھ نہ پوچھیے کہ کیا ہو گئے - ایک احمق توم کا شخص تھا اسکا بیٹا ایک عالم کے پاس کچھ عربی فارسی پڑھنے لگا - اسکے یہاں سات پشت سے بھی کوئی پڑھا لکھا شخص نہ گذرا تھا جب اس نے ہدایت النحو شروع کی تو آپ گئے مولوی صاحب کے پاس اور کہنے لگے کہ اجی اسے بہت نہ پڑھا دیجو - کہیں یہ لوٹ پوٹ پیغمبر نہ ہو جائے - صاحبزادہ صاحب نے

ہدایت النحو کیا شروع کی اُسکے نزدیک گویا پیغمبری ملنے لگی۔ نعوذ باللہ۔ تو اوچھے لوگ کیا سمجھیں کہ علم کیسا ہوتا ہے۔ اُسکے خاندان میں کوئی یہ بھی نہ جانتا تھا کہ علم کہتے کسے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم جیسے ہمنے پانچ وقت کی نماز کیا پڑھ لی جنت کے خریدار ہی بن بیٹھے۔ بس مطمئن ہیں کہ نیلام ہمارے ہی نام ختم ہوگا جبکہ اتنی بڑی قیمت بھی ہمنے لگادی ہے۔ ایک طالب علم کسی معقول خانہ کے پڑھے ہوئے تکمیل کی غرض سے دیوبند آئے۔ دیوبند میں ماشاء اللہ نمازوں کا بڑا اہتمام ہے کوئی تاکید نہیں کوئی جرمانہ نہیں مگر علم دین کی یہ برکت ہے کہ خود بخود سب طلبا پابند ہیں۔ انھوں نے معقول خانہ میں بھلا یہ رنگ کہاں دیکھا تھا کہنے لگے میاں نمازوں کا کچھ ٹھکانا بھی ہے ہر وقت نماز ہر وقت نماز اے اللہ کہاں کی نمازیں یہاں پھٹ پڑی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں پچاس نمازوں کے بجائے تخفیف ہوکر جو صرف پانچ رہ گئی تھیں تو وہ تخفیف دوسری ہی جگہوں میں ہوئی ہے۔ مدرسہ دیوبند میں وہ پچاس کی پچاس ہی قائم رکھی گئیں جہاں دو منٹ گذرے بس چلو نماز کو جہاں پانچ منٹ گذرے بس چلو نماز کو۔ جان آفت میں آگئی پڑھتے پڑھتے۔ کوئی کہاں تک پڑھے جاوے اُن حضرت کو یہ پانچ نمازیں بھی پچاس نظر آتی تھیں تو ایسا شخص اگر پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگے تو نہ معلوم اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگے پھر ایسوں میں سے۔ خاصکر جو دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اُن کی حالت تو کچھ پوچھئے ہی نہیں یعنی ایک جماعت کی جماعت ہے ہم مسلمانوں میں جس نے دنیا کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے۔ اُن کا مذاق یہ ہے کہ دین تو ادنیٰ درجہ کا بھی کافی ہے مگر دنیا اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہئے۔ حالانکہ مذاق یہ چاہیے تھا کہ دنیا تو ضرورت کے موافق اور دین تو کمال کے درجہ کا۔ اسی کو حضرت غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ؎

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا — وما اراھم رضوا فی العیش بالدون
فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما — استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

یعنی جیسا ان امرا نے یہ کیا ہے کہ تھوڑے سے دین پر قانع ہو گئے ہیں حالانکہ دنیا کو ادنیٰ درجہ پر قانع نہیں اسی طرح تم یوں کرو کہ دنیا کے تو ادنیٰ درجہ پر قناعت کرلو لیکن دین کے ادنیٰ درجہ پر ہرگز قناعت نہ کرو بلکہ ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے حصول کی فکر میں لگے رہو

کیونکہ دین کے درجات کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ اسکا اعلیٰ درجہ بھی گویا ادنیٰ ہی درجہ ہے۔
اسکی شان ہے وراء الوراء ثم وراء الوراء۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

جیسے دنیا میں ترقی کرنیوالے برابر کوشش کرتے رہتے ہیں تم دین میں ترقی کی برابر کوشش کرتے رہو۔ کسی وقت چین نہیں چاہیے اور واقعی چین کیسے آسکتا ہے۔ عاشق کو تو چین مرتے دم تک بھی نہیں اسکی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

اسکی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

دل آرام در بر دل آرام جو لب از تشنگی خشک بر طرف جو
نہ گویم کہ بر آب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اور اسکی یہ حالت ہوتی ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

دیکھیے تو اگر کوئی آدمی کسی مردار عورت پر فریفتہ ہو جائے اور وہ عورت اسکو اپنے وصال سے محظوظ بھی کر دے تو کیا اسکا جی بھر جائیگا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ یہی کہیگا کہ ہائے عشق کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ساری عمر بھی میں کر پاس رہے تب بھی جی نہ بھرے۔ جب ایک ادنیٰ سی مردار عورت کے عشق میں یہ حالت ہے کہ ساری عمر بھی وہ پاس رہے تب بھی جی نہیں بھرتا تو مولانا فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن صبر چوں داری ز رب ذوالمنن
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری ز نعم الماہدون

جب دنیائے دوں سے جی نہیں بھرتا تو خدا سے کیسے جی بھر گیا ایک کلمہ پڑھکر قناعت کرلی کہ بس بہت ہے دخل الجنۃ کا وعدہ مرتب ہو ہی جائیگا۔ اے صاحبو دخل الجنۃ بالکل سچ ہے مگر اسکے قبل دوزخ کیسی ہے کچھ دیکھتے بھی ہو۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالدار اسکو کہتے ہیں جسکے پاس معتد بہ مال ہو اسی طرح مسلمان اسکو کہتے ہیں جسکے پاس معتد بہ اسلام ہو۔ اس

غلطی میں عام طور پر لوگ مبتلا تھے اسلئے اسکا بھی رفع کرنا مقصود تھا۔ غرض یہ بھی وجہ ترجیح تھی اس آیت کے اختیار کرنے کی۔ تو غرض اس آیت کو اسلئے اختیار کیا ہے کہ اسمیں جو مضمون مذکور ہے اس میں حق جل وعلا شانہٗ نے اسلام کی حقیقت بتائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے تو فرماتے ہیں ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ فرماتے ہیں کون شخص ایسا ہے جو اعراض کرے ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے ابراہیم علیہ السلام کا طریق تو ایک ایسی ملت تھا اور ایک ایسا مشرب تھا کہ کون سا مقبول بندہ ہے جو اس سے روگردانی کرے اعراض کرے ابا کرے استغنا کرے اسکو ترک کرے یا اس سے ہٹ جائے سوا اسکے جس نے اپنے نفس کی بیقدری کی سوا اسکے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی۔ سوا اسکے کوئی ایسا نہ کریگا۔ مطلب یہ ہے کہ جو نفس کی قدر جانے گا وہ اسکو نفع پہونچائیگا اور ضرر سے بچائیگا۔ کیونکہ نفس کی یہی قدر ہے اسکو نفع پہونچانا اور اسکو مضرت سے بچانا۔ تو جو اپنے نفس کی قدر جانیگا وہ ملتِ ابراہیمی کو ضرور اختیار کریگا۔ اور کیوں نہ اختیار کریگا جب وہ چیز ہی اس درجہ کی ہے کیونکہ اسکی ہی برکت سے ابراہیم علیہ السّلام اس درجہ کو پہونچے جسکو فرماتے ہیں۔ ولقد اصطفینٰہ فی الدنیا یعنی ہمنے انہیں مقبول بنایا تھا دنیا میں۔ اور حرف تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں وانہ فی الآخرۃ لمن الصٰلحین اور آخرت کے اندر بھی وہ صالحین میں سے ہیں یعنی اس ملت کی برکت سے وہ دنیا میں بھی مقبول تھے اور آخرت میں بھی مقبول ہیں۔ تو وہ ملت ابراہیم ایسی چیز ہے کہ اسکی بدولت ابراہیم علیہ السلام ایسے درجہ کو پہونچے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کتنی بڑی چیز ہوگی۔ پھر بھلا ایسی چیز سے کون اعراض کریگا سوا جاہل کے اور سوا اسکے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی آگے اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے ارشاد ہے اذ قال لہ ربہ اسلم یعنی جب انکے رب نے کہا کہ اسلام اختیار کرو۔ اگر کوئی کہے کہ حضرت ابراہیم تو اسلام پہلے سے بھی لائے ہوئے تھے تو پھر اسکے کیا معنی تو یوں سمجھو کہ یہ کہنا ایسا ہے جیسے میانجی نے سبق پڑھا دیا۔ لڑکے نے اسے یاد کر کے سنا بھی دیا۔ اب دوسرے دن میانجی نے جب کہا کہ آؤ سبق پڑھو تو وہ کہے کہ اجی کل تو سبق پڑھ چکا ہوں اور یاد کر کے سنا بھی چکا ہوں۔ یہ آج پھر پڑھانا کیسا۔ تو وہ

میانجی کہتا ہے کہ ارے بھائی کل جو تنے پڑھا ہے تو کیا ساری کتاب ختم کر لی ہے۔ کیا اب کچھ پڑھنے کو باقی نہیں رہا۔ کیا ایک ہی سبق میں علم کی پوری تکمیل کر چکے۔ ارے ابھی اور بھی تو بہت کچھ پڑھنا پڑھانا ہے۔ تو جس طرح میانجی کہتا ہے کہ اور پڑھو اسی طرح یہ ارشاد ہے کہ اسلم مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں لڑکے نے یہ بھی کہدیا تھا کہ کل تو پڑھ چکا تھا اور یہاں کوئی نبی ایسا نہیں جو اسلم کے جواب میں یہ کہا کہ اسلام تو لا چکا بلکہ جواب میں وہ کہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا یعنی یہ کہا اسلمت لرب العالمین۔ کہ میں نے اسلام اختیار کیا یہ ترجمہ کا حاصل ہوا۔ اسمیں تعیین ہو گئی اُس ملت کی کہ وہ کیا ہے یعنی اسلام۔ غرض ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ جو آیت میں نے بیان کیلئے اختیار کی ہے اسمیں اسلام ہی کی فضیلت مذکور ہوئی ہے اور معلوم ہوا کہ یہی وہ ملت ابراہیمی ہے جسکی ترغیب دیگئی ہے۔ اب اسکے ساتھ اگر سیاق اور سباق کو بھی ملا لیجئے تو اسلام کی فضیلت اور عظمت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی اسکے قبل حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ جمع ہو کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی اُسکا واقعہ مذکور ہے اور اُس دوران میں جو دعائیں دونوں نے ملکر مانگی تھیں وہ نقل کیگئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم پھر اُن کی دوسری دعا نقل فرمائی ہے۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک تو یہاں اپنے واسطے بھی دعا مانگی ہے کہ اے اللہ ہمکو سچا مسلمان بنا دے۔ دیکھئے کتنی بڑی چیز ہے اسلام کہ انبیا علیہم السلام بھی باوجود اتنے بڑے درجہ پر ہونیکے یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں کامل اسلام عطا فرما پھر کتنی بڑی سخاوت اور خیر خواہی ہے کہ اپنے ساتھ ہم نالائقوں کو بھی یاد فرمایا۔ ومن ذریتنا اور اے اللہ ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان جماعت بنائیو خواہ وہ اولاد جسمانی ہو یا روحانی۔ اسواسطے کہ ایک جگہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ملۃ ابیکم ابراھیم اسکے مخاطب ہیں امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساری امت کے حسی باپ نہیں ہو سکتے تو لامحالہ یہاں روحانی باپ ہی ہونا مراد ہے

اور اگر کہا جائے کہ خاص عرب مخاطب ہیں جنکے آپ جسمانی باپ بھی ہیں تو اس آیت کا سباق
و سیاق اُسکا مساعد نہیں چنانچہ اوپر یا ایہا الذین امنوا میں عام اہل ایمان کو خطاب ہے کہ خاص عرب کو پھر آگے
سماکم المسلمین اور تکونوا شہداء واقع ہے جو کہ صفت مشترکہ ہے تمام امت کی تو معلوم ہوا
کہ ابیکم عام ہے جسمانی باپ ہونیکو بھی اور روحانی باپ ہونیکو بھی۔ غرض وہ یعنی اہل عرب
جسمانی اولاد ہیں اور غیر اہل عرب روحانی اولاد ہیں ان سبکو بھی اپنے ساتھ دعا میں یاد فرما لیا
البتہ اُس اولاد میں سے اُن کو مستثنے کر دیا جو اسلام کے ساتھ موصوف نہ ہوں چنانچہ یوں
نہیں فرمایا و ذریتنا۔ بلکہ من بڑھا دیا کیونکہ اسکے قبل جو انی جاعلک للناس کی بشارت
سنکر دعا کی تھی و من ذریتی اور اسکے جواب میں ارشاد ہوا تھا لا ینال عھدی الظالمین
اس سے اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ ایسے بھی ہوں گے جو طریق حق پر نہ ہوں گے اسلئے اس دعا
میں اُن کو مستثنے کر دیا اس دعا میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ آپنے لقب اس
امت کا مسلمہ رکھا جسکا ذکر ایک تفسیر کی بناء پر دوسری آیت میں بھی ہے ھو سماکم المسلمین
کیونکہ اسکی ایک تفسیر یہ بھی ہے۔ اور ایک تفسیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف
ضمیر راجع ہو۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے بھی اسلام کو ثابت کیا اور امت محمدیہ
کے لئے بھی اسلام کی درخواست کی اس سے اسلام کا جو کچھ شرف ثابت ہے ظاہر ہے۔ یہ تو
سباق میں نظر تھی آگے سیاق یعنی مابعد میں دیکھئے تو ایک صفحہ کے اندر ہی اندر جابجا اسلام
کا ذکر فرمایا گیا ہے سباق و سیاق میں جو میں نے غور کیا تو سات جگہ اسلام کا ذکر ہے ایک
واجعلنا مسلمین میں دوسرا امۃ مسلمۃ لک میں تیسرے قال لہ ربہ اسلم میں چوتھے اسلمت
لرب العلمین میں پانچویں فلا تموتن الا وانتم مسلمون میں چھٹے ونحن لہ مسلمون
میں ساتویں لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون میں اور محاورات عرب میں سات کا
عدد یہ کثرت کا مرتبہ ہے اور جب اور مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو ستر کا عدد استعمال کیا جاتا ہے
چنانچہ سات اور ستر کا استعمال کثرت کیلئے احادیث کثیرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ اسلام کا کیا درجہ ہے کہ ایک ہی مقام پر بار بار اسکا کس طرح ذکر کیا جاتا ہے نیز اس مقام
کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کا مذہب اسلام ہی رہا ہے۔ تو اسلام اتنی قدر

کی چیز ہے۔ صاحبو اسلیئے میں نے یہ مضمون بیان کیلئے اختیار کیا ہے یہ تو اسلام کی اہمیت وعظمت کا ذکر ہوا۔ اب اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیئے جسکو میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔ اسلام اصل میں ایک لغت عربی ہے پھر اور قرآن حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصوص میں جو اس لفظ کا استعمال کیا گیا تو اسکے ساتھ لغوی معنوی پر صرف ایک قید بڑھ گئی ہے۔ اس لحاظ سے دو قسم کا اسلام ہوا ایک تو اسلام لغوی اور ایک اسلام شرعی۔ اسلام لغوی کے معنی ہیں سپردن سونپ دینا۔ اسی کو تعبیر کر دیتے ہیں گردن نہادن یہ طاعت سے غرض جو تسلیم کے معنی ہیں وہی اسلام کے معنی ہیں۔ مادہ دونوں کا سین لام میم ہے اور ان حروف میں تسلیم کے معنی مودع ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے بلیٰ من اسلم ای من فوض ذاتہ للہ یعنی جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کیلئے۔ غرض اسلام کے معنی ہیں سپرد کر دینا۔ شریعت نے اسمیں ایک اور قید بڑھائی یعنی ایک قید تو اسلم کے معمول میں بڑھائی اور ایک قید اسکے متعلق میں بلغوی اسلام میں کوئی قید نہیں۔ اسکے معنی ہیں مطلق سپرد کرنا۔ جسکو چاہے سپرد کرنا اور جسکے چاہے سپرد کرنا۔ اب اسلام شرعی کی قیدیں سنیئے۔ ایک قید تو یہ ہے کہ اسلم کا معمول کون ہے خود اپنی ذات اور اسکا متعلق کون ہے۔ اللہ۔ حاصل کیا ہوا اپنے کو اللہ کے سپرد کرنا۔ یہ ہے حقیقت اسلام شرعی کی۔ اب گویا میں طالب علمانہ عنوانات سے تو فراغت کر چکا۔ میں نے چاہا تھا کہ ایسے علمی عنوانات بیان میں نہ آنے پائیں کیونکہ یہاں کے اکثر حضرات بوجہ اختلاف زبان ایسے مضامین کو کم سمجھتے ہیں مگر کیا کیا جائے بغیر ایسے طالب علمانہ عنوانات کے مضمون منضبط نہیں ہوتا اور مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اب میں انشاء اللہ بالکل عام فہم تقریر کرونگا۔ مگر غالب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں پھر بھی ایسے الفاظ آہی جاوینگے خیر ایک آدھ جگہ اب بھی سہی۔ اب بعد تفسیر اسلام کے یہ دعوے قرآن مجید سے ثابت ہو گیا کہ تمام انبیا کا مذہب اسلام یعنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنا رہا ہے۔ اور آپ کو بھی اسی کی تعلیم دیگئی ہے۔ بلکہ آپ کو تو اور امم پر ایک خاص شرف منجانب اللہ عطا ہوا ہے وہ یہ کہ گو تمام اطاعت کرنیوالوں کی صفت یہی تھی یعنی اسلام مگر لقب خاص آپکو ہی دیا گیا یعنی اطاعت کرنے والے اور اسلام لانے والے اور امتوں میں بھی تھے مگر لقب امت مسلمہ

کسی کا بھی نہیں تھا۔ جتنے مقبولان حق گذرے ہیں صفت سبکی اسلام تھی مگر لقب خدا تعالیٰ نے امتِ مسلمہ اور کسی کو نہیں دیا۔ مثلاً ایک زمانہ میں دین حق کا لقب عیسائیت تھا ایک زمانہ میں یہودیت تھا وعلیٰ ہذا القیاس اور گو ہر امت کا ایک خاص طریق رہا ہے یعنی باعتبار فروع کے مگر یہ صفت سب میں مشترک تھی کہ سب خدا تعالیٰ کے مطیع بندے تھے حاصل یہ کہ مشترک صفت سبکی اسلام تھی۔ لیکن لقب امت مسلمہ کا خاص آپ کو ہی عطا کیا گیا۔ یہ کتنا بڑا شرف ہے پھر شرف پر شرف یہ کہ لقب بھی ملا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطہ سے یہاں گورنمنٹ اگر کسی معزز حاکم کے ذریعہ سے آپ کو کوئی لقب دے تو اس میں دو شرف سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ گورنمنٹ کا دیا ہوا لقب ہے۔ پھر ایک معزز حاکم کے ذریعے سے اُس لقب کو ہم تک پہونچایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو لقب عطا فرمایا ہے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے معزز پیغمبر کے زبان سے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان وہ ہے کہ اگر وہ اپنی رائے سے بھی ہمارے لئے یہ لفظ فرما دیتے تب بھی بہت بڑا شرف تھا نہ کہ جب رائے سے بھی نہ ہو بلکہ آپ کی یہ شان ہو ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کی خصوص ہمارے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے حضرات اولیاء اللہ ایسے گذرے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کہا اپنے منہ سے نہیں کہا بلکہ خود حق تعالیٰ نے اُن کی زبان کے واسطے سے کلام کیا۔ ایک قصہ میں نے اپنے اُستاد علیہ الرحمہ سے سنا ہے کہ ایک بزرگ تھے اُن کے پاس ایک مرد اور ایک عورت اپنے بچہ کو لائے جو مادرزاد اندھا تھا یعنی وہ ماں کے پیٹ ہی سے اندھا پیدا ہوا تھا۔ اور دونوں رونے لگے کہ حضرت اول تو ہمارے اولاد ہی نہ ہوتی تھی۔ بہت دعائیں کیں منتیں مانیں تب تو کہیں یہ بچہ عنایت ہوا۔ مگر افسوس ہم لوگ پھر بھی محظوظ و مسرور نہ ہو سکے کیونکہ یہ اندھا پیدا ہوا۔ اب اسکو دیکھ دیکھ کر ہر وقت جی کڑھتا ہے ہمنے سنا ہے کہ آپ بہت بڑے مقبول الدعوات بزرگ ہیں۔ بیشک ہمارے حال زار پر رحم فرمایئے اور دعا کر دیجئے کہ اسکی آنکھیں اچھی ہو جائیں۔ اُس زمانہ کے لوگ آج کل کی طرح بدعقیدہ نہ تھے

یہ نہیں کہا کہ آپ اچھا کر دیں بلکہ یہ کہا کہ آپ دعا کر دیں مگر یہ درخواست سنکر بھی کمال انکسار کے غلبہ سے آپ کو جوش آگیا۔ اور فرمانے لگے بگڑ کر کہ کیا میں عیسیٰ ہوں جنکی دعا سے اندھے مادرزاد اچھے ہو جاتے تھے۔ وہ بیچارے مایوس اور شکستہ دل ہو کر چلے گئے۔ بس انکا جانا تھا کہ اُن بزرگ کی زبان پر بے اختیار یہ جاری ہو گیا ماکنیم ماکنیم۔ ہم اچھا کرینگے ہم اچھا کرینگے۔ لاؤ اسکو بلا کر۔ خدام کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا تو عیسیٰ بھی نہ بنتے تھے یا اب خدا ہی بننے لگے۔ مگر اسوقت کچھ کہنا بے ادبی تھا۔ دوڑ کر اسکو بلا لائے۔ آپنے اپنا ہاتھ اس بچہ کی آنکھوں پر پھیر دیا۔ بس ہاتھ پھیرتے ہی آنکھیں اچھی خاصی ہو گئیں۔ اور وہ لوگ دعائیں دیتے ہوئے خوش بخوش اپنے بچہ کو گھر لیگئے۔ اسکے چلے جانیکے بعد موقع پاکر بعض خاص خادموں نے عرض کیا کہ حضرت یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یا تو دعا کرنا بھی گوارا نہ تھا یا ایک ساتھ ایسے دعوے کے الفاظ فرمانے لگے ماکنیم ماکنیم۔ آپنے فرمایا بھائی یہ میں نہیں کہتا تھا۔ بات یہ ہے کہ جسوقت وہ لوگ چلے گئے تو مجھ پر عتاب ہوا کہ تمنے جو عیسیٰ کا نام لیا تو کیا وہ اچھا کرتے تھے کیا وہ تھے قادر مطلق اور فاعل حقیقی یا ہم تھے ہم تو اب بھی قادر مطلق ہیں۔ پھر کیوں نہیں ہم سے عرض کیا۔ اگر اچھا کرتے تو ہم کرتے۔ تم کون تھے اسکو مایوس کر نیوالے اور اگر اب بھی اچھا کرینگے تو ہم کرینگے۔ غرض اُدہر تو وہ مایوس ہو کر چلے ادہر مجھپر یہ عتاب ہوا اور بے اختیار میرے منہ سے وہی الفاظ خدا تعالیٰ کے نکلنے لگے۔ ماکنیم ماکنیم۔ میں تو توبہ یہ الفاظ کیسے کہہ سکتا تھا۔ میری بھلا کیا مجال ہے۔ وہ تو حق تعالیٰ فرما رہے تھے میں تھوڑا ہی کہہ رہا تھا۔ تو اولیاء اللہ کی بعض بعض کی یہ حالت ہوئی ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

اولیاء کی جب یہ شان ہے تو انبیا کی شان کا تو کیا کہنا۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زبان مبارک سے مسلم کا لفظ نکلنا بہت بڑا شرف تھا۔ کہ خود حق تعالیٰ نے ان کے منہ سے یہ لفظ کہلوایا اور ہم نالائقوں کو یہ لقب دلوایا۔ تو اس سے بڑھکر اور کیا شرف ہو سکتا ہے تو دیکھا آپ نے یہ کتنا شریف لقب ہے۔ مگر اب بس کسر اتنی ہے کہ ہم محض لفظوں پر قانع ہو گئے بقول مولانا کے ؎

میم و واؤ و میم و نون تشریف نیست　　　لفظِ مومن جز پئے تعریف نیست

یہ جو حروف ہیں مومن کے میم واؤ میم نون جن سے لفظ مومن بنا ہے یہ تو محض ایک پتہ کا لفظ ہے باقی میم واؤ میم نون میں کیا رکھا ہے۔ ان سے کہیں کوئی مومن ہوتا ہے۔ ایمان تو قلب سے متعلق ہے مومن تو وہی ہے جسکے دل کے اندر ایمان رچا ہوا ہو۔ سو واقعی بالکل ٹھیک ہے۔ اے صاحبو محض لڈو کے لفظ کہنے سے کہیں منہ میٹھا ہو سکتا ہے محض روپیہ کے لفظ سے کہیں تم جہاز کے مالک بن سکتے ہو۔ ہماری تو وہ مثال ہو رہی ہے لفظ پرستی کی جیسے کوئی مہاجن تھا۔ اسکے کوئی منیم جی تھے یا منیب جی تھے ہمیں تحقیق نہیں کہ یہ کیا لفظ ہے وہ بیچارے تھے مفلس۔ ایک دن بیٹھے کارخانہ کا حساب کتاب کر رہے تھے۔ ایک سائل آیا مگر وہ مہذب تھا چپکا کھڑا رہا کہ اسوقت مشغول ہیں لالہ جی۔ فارغ ہوں تو مانگوں۔ دیر تک کھڑا سنتا رہا کہ دو اور دو چار۔ چار اور چھ دس۔ دس کا صفر حاصل ایک۔ دس اور دو۔ بارہ۔ بارہ کے دو۔ حاصل ایک۔ غرض کہیں حاصل ہوا ایک کہیں ہاتھ لگے دو کہیں حاصل ہوئے چار کہیں ہاتھ لگے چھ۔ وہ برابر کھڑا گنتا رہا۔ دس ہوئے پچاس ہوئے سو ہوئے۔ اے اللہ کتنے حاصل ہوں گے مگر وہ سائل دل میں بڑا خوش کہ یہ تو اقراری مجرم ہے۔ اس سے خوب وصول کرونگا۔ اسکے پاس انکار کا کیا عذر ہو سکتا ہے جب لالہ جی حساب سے فارغ ہوئے تو سائل نے کہا کہ اجی مجھے بھی کچھ ملجائے۔ لالہ جی بولے کہ بھائی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ اس نے کہا اجی کیوں جھوٹ بولتے ہو میرے سامنے ہی تو سیکڑوں ہزاروں حاصل کر چکے ہو۔ کبھی حاصل ہوئے چار کبھی ہاتھ لگے چھ۔ گھنٹہ بھر سے تو میں یہی قصہ دیکھ رہا ہوں۔ اور میں سب جوڑتا گیا ہوں۔ کئی ہزار تک تو نوبت پہونچ چکی ہے اور پھر کہتے ہو کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں اس نے کہا بھائی مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے لفظوں ہی میں حاصل ہوا ہے واقع میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تو حضرت نرے حساب سے تو کچھ کام چلتا نہیں۔ ایک اور بنئے صاحب تھے۔ وہ محاسب بڑے تھے۔ اور اپنی حساب دانی پر بڑا ناز تھا جیسے ہمیں الفاظ پر ناز ہے وہ اپنے کنبہ کو بیل گاڑی میں سوار کرا کے کہیں لیچلے۔ راستہ میں ندی آگئی آپ نے بہلبان سے کہا کہ ٹھیر جا۔ میں پہلے حساب لگالوں۔ کبھی گاڑی ڈوب نہ جائے پنسل کاغذ اور ایک بانس لیکر آپ ندی میں گھسے اور جگہ جگہ

بانس سے ناپنا شروع کیا۔ کنارہ کے قریب ناپا تو ٹخنوں تک پانی تھا۔ آگے چلے تو گھٹنوں تک تھا اور آگے چلے تو کمر تک تھا اور آگے چلے تو ڈوبان تھا۔ آپنے سب کو جوڑ کر اوسط نکالا تو کمر تک نکلا۔ گاڑی بان سے کہنے لگے بس حساب ٹھیک ہے چل ڈالدی گاڑی کو پانی میں۔ ڈوبے گی نہیں۔ یہ تو وہ ہی ہوئی چڑھ جا بیٹے سولی پر اللہ بھلی کریگا۔ نوکر نے کہا بھی کہ ایک جگہ پانی ڈوبان بھی تو ہے۔ اُس نے ڈانٹ دیا کہ تو کیا جانے اوسط کا اعتبار ہوتا ہے کیا ہمارا حساب غلط ہوسکتا ہے۔ کچھ ڈر نہیں ڈالدے گاڑی کو۔ وہ بیچارہ آخر نوکر تھا تابعدار تھا۔ اُس نے گاڑی کو پانی میں ڈالدیا مگر وہ پانی تو تابع نہیں ہوسکتا تھا اُن صاحب کے اوسط کا غرض تھوڑی دور چلکر حضرت لگے ڈوبنے۔ تو اسوقت بھی بجائے اسکے کہ کوئی تدبیر کرتا نکلنے کی احمق نے پھر بھی کھاتہ لیکر اپنا حساب جانچنا شروع کیا اور جب اوسط کو صحیح پایا تو آپ فرماتے ہیں کہ ارے لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں۔ حساب تو بالکل صحیح تھا پھر کنبہ کیوں ڈوبا غرض ایسے امور میں ہم اوروں پر ہنستے ہیں یہانتک کہ انہیں خبطی اور بیوقوف قرار دیتے ہیں لیکن حضرت ہماری مثال بھی بالکل اُن بنیئے ہی کی سی ہے کہ بس الفاظ پر ناز ہے جیسے اُسے اپنے حساب پر ناز تھا۔ اپنے نزدیک شیخ چلی کا سا گھر بنالیا اور خوش ہو لئے۔ یہ شیخ چلی ایک خبطی سا شخص تھا یا کوئی مسخرا تھا کسی شخص کو ایک گھڑا تیل کا اپنے گھر بھیجنا تھا۔ شیخ چلی کہیں نظر پڑ گئے کہا چل ہمارا تیل کا گھڑا تو ذرا گھر تک پہونچا دے۔ دو پیسے دینگے۔ شیخ جی نے منظور کرلیا اور سر پر گھڑا رکھکر چلے۔ اب آپنے اپنے دل میں منصوبہ گانٹھا کہ آج ہمیں دو پیسے ملیں گے اُن سے کوئی تجارت کرنی چاہیئے۔ سوچا کہ کونسی صورت اختیار کروں۔ آخر یہ طے کیا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے خریدلونگا پھر کسی مرغی والے کی خوشامد کرکے مرغی کے نیچے بٹھلا دونگا اُن میں سے دو بچے نکلیں گے۔ ایک مرغا ایک مرغی انڈوں میں بھی بھتی نہ ان کے باوا کی عملداری کہ انکی مرضی کے موافق ہی بچے نکلیں گے۔ ایک نر اور ایک مادہ۔ لیکن فرض کرنا کیا مشکل ہے غرض گھر ہی کی مرغی ہوگی اور گھر ہی کا مرغا بہت سے انڈے ہونگے اور ان کے خوب بچے ہوں گے جب بہت سے بچے ہو جائیں گے تو اُنہیں بیچکر بکریاں خریدیں گے پھر اسی طرح جب بکریاں بہت سی ہو جائیں گی انہیں بیچکر گائے خریدیں گے پھر بھینس پھر بھینسوں کو بیچکر گھوڑی لیں گے

تجارت کرینگے۔ جب ہزاروں روپیہ جمع ہو جائیں گے۔ تو ایک بڑا محل تیار کرائیں گے۔ جب کاروبار
بڑھے گا۔ اور تجارت کے کام میں خوب ترقی ہوگی۔ تو وزیر زادی سے نکاح کرینگے۔ یہاں تک
پہونچے ہیں۔ حضرت۔ پھر بچہ بھی ہو جائیگا۔ جب وہ بڑا ہوگا۔ تو اندر سے ہمیں بلانے آئیگا۔ کہ ابا
جان چلو اماں جان نے بلایا ہے۔ ہم اُسے ڈانٹ دینگے کہ ہشت ہم نہیں چلتے۔ ہمیں فرصت
نہیں ہے۔ اس ہشت کہنے میں آپنے سر جو ہلایا۔ بیہوشی میں گھڑا آپکے گر پڑا۔ اور تمام تیل
زمین پر پھیل گیا۔ مالک خفا ہونے لگا۔ کہ ارے کمبخت یہ تونے کیا حرکت کی تو آپ
فرماتے ہیں۔ میاں جاؤ بیٹھو تم اپنے ذرا سے تیل کو لئے پھرتے ہو۔ میرے نقصان کو نہیں
دیکھتے۔ میرا تو سارا بنا بنایا گھر ہی بگڑ گیا۔ سارا کنبہ اور تجارت ہی غارت ہوگئی۔ بیوی بچے سب
ختم ہوگئے۔ تو حضرت یہاں بنا لیجئے۔ آپ شیخ چلی کا سا محل۔ قیامت میں معلوم ہوگا۔ کہ نہ کوئی ہاتھی
ہے نہ گھوڑا نہ کوئی ساز ہے نہ سامان۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ یہاں تو یہ دعویٰ ہیں
کہ نحن کذا نحن کذا۔ ہم ایسے ہم ویسے۔ وہاں حقیقت معلوم ہوگی کہ ہم کیا ہیں کچھ بھی نہیں۔ بس
کیا ہے۔ تھوڑا سا علم پڑھ لیا۔ مولانا صاحب ہوگئے۔ دو چار ضربیں لا الٰہ الا اللہ کی لگالیں
اور کچھ سُرسُری بدن میں ہونے لگی۔ تو بس شاہ صاحب بن بیٹھے۔ گویا سارے کمالات اپنے نزدیک
ہمیں پورے کرلئے مگر واقعی حالت ہماری یہ ہے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند
این جملہ شدی ولے مسلماں نشدی

حضرت بالکل سچ ہے۔ مولوی صاحب شاہ صاحب بن لینا آسان سوداگر ملک التجار سیٹھ صاحب
بن لینا آسان۔ لیکن اگر مشکل ہے تو مسلمان بننا یعنی ہم لوگوں کی سستی اور کاہلی کی بدولت مشکل ہی
ورنہ واقع میں تو الدین یسر۔ دین میں سرتاسر سہولت ہی سہولت ہے چنانچہ ارشاد ہے ما جعل
علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین دیکھئے یہاں بھی ذکر
ملت ابراہیم یعنی اسلام ہی کا ہے جسکی تمہید یہ ہے کہ ما جعل علیکم فی الدین من حرج اس سے
صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو دین ہے۔ کیونکہ دین سے مراد بقرینہ ما بعد وہی ہے۔ اس میں
تمہارے واسطے ادنیٰ درجہ کا بھی حرج یعنی تنگی نہیں ہے حرج نکرہ ہے اور تحت میں ہے نفی کے اور نکرہ جو تحت
میں نفی کے ہوتا ہے عموم کیلئے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ذرا بھی تنگی نہیں۔ حضرت آئندہ ارادہ ہوی

نہیں ہو سکتا تھا اگر ذرا بھی احتمال ہوتا تنگی کا کیونکہ ہر زمانہ میں اسلام کے دشمن کثرت کے ساتھ رہے ہیں۔ پھر کفار عرب کا تو مقابلہ تھا۔ خاص جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وہ لوگ رات دن اعتراض ڈھونڈا کرتے تھے چنانچہ ارشاد بھی ہے یبغونہا عوجا۔ دین میں ہمیشہ کجی کا کمی کا اعتراض ڈھونڈا کرتے تھے مگر ملتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ علی الاعلان دعوی کیا گیا ذالک الکتاب لاریب فیہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں اگر کوئی شبہ ہو تو پیش کرو۔ حضرت ایسے زمانہ میں جبکہ عرب بلکہ تمام عالم حضور کے دشمنوں سے بھرا پڑا تھا اگر اس دعوی میں ذرا بھی شائبہ شبہ کا ہوتا تو حضرت وہ لوگ تو حضور کی زندگی مارے اعتراضوں کے تلخ کر دیتے۔ گنواتے کہ فلانے حکم میں یہ تنگی ہے فلانے حکم میں یہ ثقل ہے فلانے حکم میں یہ گرانی ہے۔ تو جبکہ لاکھوں مخالف تھے بلکہ سارا عالم مخالف تھا ایسے وقت یہ دعوے کیا گیا کہ ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ اور اسکے رد میں کوئی انگشت نمائی بھی نہ کر سکا اور آج یہ نئے عقلا اعتراض کرنے بیٹھے ہیں کہ دین میں یہ سختی ہے دین میں یہ تکلیف ہے دین میں یہ دشواری ہے۔ اگر واقعی تکلیف یا تنگی ہے کسی قسم کی تو فرمائیے اس زمانہ کے لوگوں نے یہ اعتراض کیوں نہیں پیش کیا اور اگر کہو کہ پیش کیا ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں تو منقول ہونا چاہیے کیونکہ اس زمانہ سے اب تک مخالفت کی میراث برابر چلی آرہی ہے تو اگر کوئی مخالف ایسی بات کہتا جس کا حضور سے جواب نہ بن پڑا ہوتا تو ان کے ورثا اور نائب اسکو ضرور نقل کرتے چلے آتے اور آج تاریخ میں وہ بات ضرور منضبط ہوتی بات یہ ہے کہ کسی کا منہ نہ تھا کہ سچی بات کو رد کرے گو ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ ہم رد کر سکتے ہیں چنانچہ کبھی کبھی کھسیان پن اوتارنے کو یہ بھی کہہ دیا کہ لو نشاء لقلنا مثل ھذا اگر ہم چاہیں تو اسکا معارضہ کر سکتے ہیں مگر ہم چاہتے ہی نہیں۔ ارے بھائی کیوں نہیں چاہتے۔ اور کب چاہو گے۔ اس سے زیادہ اور کون وقت آویگا اس وقت سے زیادہ کیا ذلیل ہوگے کہ جزیہ تم پر مقرر کیا گیا قتل تم کئے گئے قید تم ہوئے اور دو لشکر ہی کی نوبت اور ساعت نہیں آئی۔ بس معلوم ہوا کہ واقع میں عاجز تھے کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور صاحب حضور تو حضور آج حضور کے غلامان غلام دعوی کے ساتھ کہتے ہیں چنانچہ اس وقت میں ہی صلائے عام اور ندائے عام دیتا ہوں ساری دنیا کو کہ ایک مقام پر بھی دین میں تنگی تو ثابت کر دے ایک شخص بھی تنگی

نہیں کر سکتا۔ اور صاحب یہ نہ سمجھئے کہ یہ یوں ہی اُڑا رہا ہے۔ دین میں تنگی تو ہم رات دن مشاہدہ کرتے ہیں تو ہاں ممکن ہے یہ وسوسے دل میں دوڑے ہوں کہ صاحب یہ غضب کا دعویٰ ہے کہ دین میں کوئی تنگی ہے نہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً تجارت ہی میں لاکھوں تنگیاں ہیں جن سے لین دین ہی۔ ہم اُن سے کہتے ہیں کہ ہم سود نہیں دیتے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ ہم مال نہیں دیتے اب مرو بھوکے۔ تم تو کہتے ہو کہ دین میں تنگی نہیں ہے اور اپنی آنکھوں سے تنگی دیکھ رہے ہیں۔ تو ممکن ہے یہ وسوسے دل میں دوڑے ہوں مگر واقعہ یہی ہے کہ دین میں ذرا تنگی نہیں چنانچہ اس مضمون پر میرا ایک مستقل بیان ہو چکا ہے نفی الحرج اسکا نام ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ لکھوا لکھوا کر بغل میں رکھ لیتے ہیں صاف کر کے شائع نہیں کرتے ورنہ وہ بیان اسوقت پیش کرنیکے قابل تھا اُسمیں میں نے یہی ثابت کیا ہے کہ دین میں مطلق تنگی نہیں جسوقت میں نے اس بیان کے شروع میں یہ دعویٰ کیا تھا بڑے بڑے عقلا موجود تھے۔ اور سب حیران تھے کہ اتنا بڑا دعویٰ کیونکر نبھیگا۔ اسکا تو خلافِ واقع ہونا بالکل ظاہر ہے مگر جب بیان ختم ہو چکا تو سب نے تسلیم کر لیا کہ صاحب واقعی ثابت کر دیا۔ خیر وہ سارا وعظ تو کہاں نقل کر سکتا ہوں۔ اسوقت ایک چھوٹی سی بات عرض کرتا ہوں انشاء اللہ وہی کافی ہو جائیگی۔ سارے وسوسوں کے لئے یہ جو آیت ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج اسمیں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ سو یہ دیکھئے کہ حق جل شانہ نے تنگی کی نفی کس سے کی ہے۔ ظاہر ہے دین سے کی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ تنگی جو پیش آتی ہے اسکا محل آیا دین کا کوئی جزو ہے یا کچھ اور ہے اسی کی نظیر ایک اور آیت یاد آئی ذالك الكتاب لا ریب فیہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ اسمیں کوئی شک ہی نہیں یہاں بھی بڑا شبہ واقع ہوتا ہے کہ صاحب کہتے ہیں اسمیں کوئی شک ہی نہیں حالانکہ اس میں ہزاروں کو شک ہے۔ اسکا ایک بہت اچھا جواب ہے وہ یہ کہ لاریب کا تعلق اگر ہے تو قرآن کے ساتھ ہے نہ کہ لوگوں کے ساتھ یعنی در اصل خود قرآن میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے اور اگر کوئی خواہ مخواہ شک کرے تو یہ شک اس شک کرنے والے کے اندر ہوا نہ کہ قرآن کے اندر کہ وہ بالکل پاک ہے ہر قسم کے شک و شبہ سے اگر کوئی کہے کہ یہ تو محض شاعری ہے یوں تو ہر صاحب باطل اہل حق کو کہہ سکتا ہے کہ تمکو جو شبہ ہے طرق میں شک ہے اسکا محل وہ طرق نہیں ہے بلکہ تمہارا قلب ہے جواب یہ ہے

ع اسوقت وہ شائع نہ ہوا تھا لیکن بحمداللہ اب شائع ہو گیا ہے ۔۔۔ دوست

کہ اہل باطل ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ جب دلیل سے اسکا طریق باطل ہے تو محل شک وہ طریق ہی ہے بخلاف اہل حق کے کہ واقع میں جب وہ امر حق ہے تو منشا شک کا وہ امر حق نہ ہوگا معترضین کا صرف ذہن ہوگا اور میں اسکی ایک نظیر رکھتا ہوں۔ ایک شخص نہایت سفید کپڑے استری کئے ہوئے اور کلف دار پہنے ہوئے ہے۔ اور ایک شخص ہے کہ زرد شیشوں کی عینک لگائے ہوئے ہے یا یرقان صفراوی کا بیمار ہے جسے دنیا کی ہر چیز میں زردی ہی زردی نظر آتی ہے یا بقول مولانا چونکہ برگردی در گرد دسرت۔ کوئی کہنے لگے کہ زمین کو حرکت ہو رہی ہے میرا سارا گھر گھوم رہا ہے تو اس سے یہی کہا جاویگا کہ گھر تو کیا تیرا سر گھوم رہا ہوگا۔ حالانکہ اسکا مشاہدہ ہے وہ کہیگا کہ کیا غضب کی بات ہے تم میرے مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہو مگر ہم کہیں گے کہ ہم تیرے مشاہدہ کو غلط نہیں کہتے تجھے تو واقعی گھر گھومتا ہوا معلوم ہو رہا ہوگا مگر فی الواقع اس گھومنے کا گھر کے ساتھ تعلق غلط ہے تیرے سر کے ساتھ تھا تو نے گھر کے ساتھ سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مبصر سفید کپڑے کو کہے ذالك الثوب لا صفرة فيه اس کپڑے میں بالکل زردی نہیں ہے اور اسکو سنکر وہ شخص جو یرقان کا مریض ہے یا زرد عینک لگائے ہوئے ہے یہ کہنے لگے کہ میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے واللہ اسمیں زردی ہے تو محقق مبصر کی جانب سے کیا جواب ملیگا۔ وہ جواب یہ دیگا کہ بھائی تو دیکھ تو رہا ہے صحیح مگر سمجھ رہا ہے غلط۔ یہ صفرت جو تجھے نظر آرہی ہے تیری آنکھ میں ہے تیری عینک میں ہے کپڑے میں نہیں ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ دین میں تنگی نہیں ہے یہ نہیں کہا کہ آپ کے جو گاہک صاحب یا منیجر صاحب یا مال بھیجنے والے صاحب ولایت میں ہیں اُن سے معاملہ میں بھی تنگی نہیں ہے۔ ہاں دین میں تنگی نہیں ہے یہ فرمایا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اسکا جی چاہے امتحان کر لو ساری دنیا اگر یہ دین اختیار کرے پھر جو کہیں بھی گاڑی اٹکے اور قانون میں تنگی ہونے نہ ہونیکا یہی امتحان ہے کہ اگر ساری دنیا وہ قانون سہل اختیار کرلے تو کہیں گاڑی نہ اٹکے اور اگر پھر بھی کہیں گاڑی اٹکنے لگے تو یہ البتہ علامت ہے قانون کی تنگی کی۔ اور اگر اسکو سبنے اختیار نہیں کیا اور اسوجہ سے تنگی پیش آنے لگی تو یہ علامت اسکی نہیں کہ قانون میں تنگی ہے بلکہ عمل نہ کرنیوالوں میں تنگی کہی جاویگی۔ اسی طرح اگر دین کو سب اختیار کریں تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ کہیں بھی تنگی واقع نہ ہوگی مگر چونکہ بعض نے تو اختیار کیا ہے

اور بعض نے نہیں کیا اور معاملہ اُن کا ان ہی سے پڑتا ہے اسلئے اختیار کرنیوالوں کو لامحالہ تنگی پیش آئیگی لیکن محل تنگی کا وہ اختیار نہ کرنیوالے ہیں نہ کہ دین۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی طبیب حاذق کسی دیہاتی کو نسخہ لکھکر دے لیکن اُس دیہاتی کا گاؤں ایک ایسا کورِدہ مقام ہے کہ جہاں نہ مرغی ملتی ہے نہ انڈا ملتا ہے نہ بکری کا گوشت نہ کدو کی ترکاری نہ ماش کی دال نہ چنے کی دال اور ملتا کیا ہے وہاں۔ کریلہ بینگن اور حضرت مسور کی دال بھینس کا گوشت غرض جتنی مضر چیزیں ہیں وہ تو وہاں ملتی ہیں اُن کے سوا اور کچھ وہاں ملتا ہی نہیں۔ ایسے دیہاتی نے حکیم صاحب سے نسخہ لکھایا پھر پوچھا کہ کھانا کیا کھاؤں حکیم صاحب نے کہا بکری کا گوشت کھاؤ بولا اجی وہ تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتا۔ کہا اچھا مونگ کی دال تورئی ڈالکر کھاؤ۔ بولا اجی یہ چیزیں بھی نہیں ہوتیں۔ بھائی لوکی کھاؤ۔ اجی وہ بھی نہیں ہوتی چنے کی دال ہی سہی۔ صاحب یہ بھی نہیں ملتی۔ غرض جو جو چیز حکیم صاحب بتاتے جائیں وہ یہی کہتا جائے کہ صاحب یہ بھی نہیں ہوتی یہ بھی نہیں ملتی۔ آخر حکیم صاحب نے جھلا کر پوچھا کہ آخر تیرے گاؤں میں کچھ ہوتا بھی ہے اُس نے کہا ہمارے یہاں تو بینگن ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا خبردار بینگن ہرگز مت کھانا سخت نقصان کریگا۔ کہا کریلہ ہوتا ہے۔ کہا یہ بھی مت کھانا مسور کی دال ملتی ہے۔ دیکھو یہ بھی مت کھانا۔ اب وہ دیہاتی صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر گئے اور کہنے لگے بس جی دیکھ لیا حکیم صاحب کو اسقدر تشدد ہے اسقدر تنگی ہے کہ جس چیز کو پوچھو یہ بھی مت کھانا جس چیز کو پوچھو یہ بھی مت کھاؤ۔ اور ایسی چیزیں بتلادیں جو ہمارے گاؤں میں ہوتی ہی نہیں۔ انکا علاج بڑا سخت ہے۔ انکے علاج میں بڑی تنگی ہے۔ سب یہی کہیں گے احمق کو کہ حکیم صاحب کے علاج میں تو تنگی نہیں اُنھوں نے تو دس چیزیں بتائیں لیکن اب وہ اسکو کیا کریں کہ تیرے گاؤں ہی میں مضر چیزوں کے سوا کوئی مفید چیز نہیں ملتی۔ تو تیرے گاؤں میں تنگی ہے احمق نہ کہ حکیم صاحب کے علاج میں۔ اب جتنی ترقی کی صورتیں ہیں ان میں سے شریعت نے سیکڑوں صورتوں کو جائز قرار دیا ہے۔ اور بہت کم صورتوں کو ناجائز بتلایا ہے لیکن اب دوسرا وہ معاملہ تو کرے جو ناجائز ہے اور وہ معاملہ نہ کرے جو جائز ہے تو سبب تنگی کا وہ ہے یا دین۔ اور یہ یقینی بات ہے جو تنگی پیش آتی ہے یا تو اہل معاملہ کی وجہ سے پیش آتی ہے جیسا ابھی ذکر ہوا اور یا آپ کی کم ہمتی کی وجہ سے پیش آتی ہے تو اُسکی ذمہ دار آپ

لوگ ہوئے یا دین تو غرض دین فی نفسہ اتنا آسان ہے کہ انہیں شائبہ بھی تنگی کا نہیں لیکن ہمنے خود اس آسان کو اپنے سوء استعمال سے دشوار بنا رکھا ہے۔ اب اسکا کیا علاج مثلاً نماز پڑھنا ہے یہ بھی کہیں مشکل ہے کہ اٹھکر چند معمولی اعمال کر لئے ویسے بھی تو تاجر صاحب ۸ بجے سو کر اٹھتے ہیں کبھی بہت سا وقت تجارت سے خالی رہتا ہے سو اگر اس درمیان میں ذرا سویرے اٹھکر فجر کی نماز ہی پڑھ لیتے تو انہیں کونسا خلل تھا تجارت کا۔ اسی طرح دین کی تو ساری باتیں آسان ہیں نماز بھی روزہ بھی مگر ہمنے خود اُن کو مشکل بنا رکھا ہے بلکہ زیادہ تر تو سبب تنگی کا کم ہمتی ہے۔ جیسے مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں ایک احدیوں کی جماعت تھی اُن کی ایک یوں ہی افواہی حکایت سنی ہے کہ دو شخص تھے ایک تو بیٹھا ہوا تھا اور ایک لیٹا ہوا۔ ایک سوار کا وہاں گذر ہوا بیٹھے ہوئے نے پکار کر کہا کہ میاں سوار ذرا یہاں تو آنا۔ وہ آیا کہ نہ معلوم بیچارہ کو کیا حاجت ہو گی۔ پوچھا کہ کیا کام ہے۔ کہا میاں یہ جو میرے سینہ پر ایک بیر پڑا ہوا ہے گھوڑے سے اتر کر ذرا میرے منہ میں ڈالدو۔ سوار نے کہا لاحول ولا قوة میں تو سمجھا تھا کہ نہ معلوم کیا ضروری اور مشکل کام ہوگا بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ خواہ مخواہ میرا راستہ کھوٹا کیا۔ ارے بھلے مانس تو خود اٹھا کر منہ میں کیوں نہیں ڈال لیتا کیا تیرے ہاتھ نہیں ہیں۔ اُس نے کہا اجی صاحب بھلا کہاں ہاتھ سینہ تک لیجاؤں پھر بیر اٹھاؤں پھر منہ تک لیجاؤں اتنا بکھیڑا کس سے ہو اگر ذرا تمہیں ڈالدو گے تو تمھارا کیا بگڑ جائیگا۔ صاحب انسان کو ایسا بھی بے مروت نہ ہونا چاہئے۔ سوار سخت متحیر ہوا اُس کے پاس والے سے کہا کہ ارے تو کس مصرف کا ہے تو بھی تو یوں ہی بیکار بیٹھا ہوا ہے۔ تو ہی بیر اٹھا کر اسکے منہ میں ڈالدے۔ اسی نے بگڑ کر کہا کہ بس جی مجھسے کچھ نہ بولو۔ نہیں تو لڑائی ہو جاویگی۔ تمھیں میرے دکھ کی میرے درد کی کچھ خبر بھی ہے۔ آئے اور بس رائے دیدی۔ اس نے اور مجھسے یہ معاہدہ ٹھیرا تھا کہ ایک دن ہم بیٹھیں اور تم لیٹے رہو اور ایک دن تم بیٹھو اور ہم لیٹے رہیں۔ اور جو بیٹھا ہو وہ لیٹے ہوئے کا کام کر دیا کرے۔ کل اسکے بیٹھنے اور میرے لیٹنے کا دن تھا مجھے لیٹے لیٹے جمائی آئی۔ ایک کتا آکر میرے منہ میں موتنے لگا یہ بیٹھا دیکھتا رہا اور کتے کو ہٹایا تک نہیں۔ اب بھلا اسے ضرور بیر کھلاؤنگا۔ سوار کی حیرت کی حد نہ رہی کہ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے عالی ہمتی کا کہ منہ کے اندر کتے کے موتنے میں بھی اسکے منتظر ہیں کہ کوئی اور ہٹا دے اور بیر اٹھا نہیں

اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور اٹھاکر منہ میں ڈالدے خود کون اٹھائے احدیت میں فرق آجائیگا۔ خیر
یہ تو واہیات بگڑی ہوئی حکایت ہے ہمارے مدرسے میں ایک طالب علم تھے۔ یہ جماعت بھی
بہت سست ہے مگر خیر دنیا کے کاموں میں سست ہو تو ہو دین میں سست نہو۔ ان کے
حجرہ میں ایک چوہیا نے سوراخ کرلیا تھا اور بہت سی مٹی باہر نکالکر جمع کردی تھی۔ وہاں ایک
حاجی ہیں انھیں طالب علموں سے محبت ہے یگانگت کا برتاؤ رکھتے ہیں وہ ایک دن اُس حجرہ
کے پاس ہوکر گذرے تو مٹی کا ڈھیر نظر آیا۔ خیر اونہیں کچھ خیال ہوا سوراخ میں وہ مٹی بھردی
اور خوب ٹھوک پیٹ کر اُسے بند کردیا۔ اگلے دن چوہیا نے پھر مٹی باہر نکالکر سوراخ کرلیا کسی
نے کہا کہ مٹی بھر کر ٹھیک کردیا ہوتا۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ حاجی جی... اُکر کرینگے حاجی جی اب
گویا اُن کے نوکر ہوگئے۔ ساری عمر کے لیئے۔ تو حضرت دنیا میں ایسی ہمت کے ابھی لوگ موجود ہیں
اسی طرح زیادہ سبب دین میں تنگی محسوس ہونیکا یہ کم ہمتی ہی ہے۔ ہم ان حکایتوں پر تو ہنستے ہے
لیکن دین کے اندر ہماری کم ہمتی کی بھی یہی حالت ہے۔ میں یہ کہتا ہوں جیسے نماز روزہ نہیں
ہوتا حضرت اگر حکام میں سے کوئی اونہیں بلادے جسکا قرب موجب عزت ہو تو جو عذراب
نماز روزہ کیلئے ہورہے ہیں اُن میں سے جو ایک بھی باقی رہ جاوے۔ جس وقت موذن کہے حی علی
الصلوٰۃ یعنی نماز کے لیے آؤ اُسوقت تو کہتے ہیں کہ بھائی ہم سے تو مسجد تک نہیں جایا جاتا۔ کون
اتنی دور جائے اور اگر کوئی اردلی آکر پیغام دے کہ صاحب کلکٹر نے آپکو یاد کیا ہے تو فخر سمجھکے
فوراً چلنے کے لیے کھڑے ہوجائیں گے۔ چار میل پر بھی ڈیرہ ہوگا تو وہیں جاکر مشغول ملاقات ہونگے
اور آکر فخر کرینگے کہ ہمیں صاحب کلکٹر نے بلایا تھا۔ تو یہ کیا بات ہے کہ وہی شخص جو محلہ کی مسجد
میں بھی نہ جاسکتا تھا اُسے چار میل کے فاصلہ پر کس نے جا پہونچایا۔ وہ کیا کہ مسجد تک جانیکا
ارادہ نہیں کیا تھا اور وہاں جانیکا ارادہ کرلیا اسی ارادہ کا نام ہمت ہے تو ساری کمی ارادہ اور
ہمت کی ہوئی۔ واقعی حضرت قصد ہی نہیں ورنہ بڑے بڑے دشوار کام آسان ہوجاتے ہیں
یہ قصد کا اثر نہیں تو اور کیا ہے کہ تجارت کے لیے کہیں افریقہ کہیں کہیں کہیں کہیں جا پہونچتے ہیں
جو شخص مسجد میں نہ جاسکے وہ ایکدم سے ناٹال اور افریقہ پہنچے۔ آخر کیا فرق ہے ارادہ ہی کا تو فرق ہے
اے حضرت اگر ارادہ دین کا کرلو اور پھر کوئی دشواری پیش آئے اُسوقت تو ہم جواب کے

دشوار ہیں اور مشورہ کے باقی جتنی دشواریاں اب پیش کیجا رہی ہیں۔ ابھی اُن کے جواب کا وقت نہیں۔ نہ سوت نہ کپاس جولاہے سے ٹھینگم ٹھینگا۔ یہ سب سوال و جواب اور قیل و قال ایسی ہے جیسی افیونیوں کی جس سے کچھ حاصل نہیں۔ افیونیوں کو مٹھائی کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ دو افیونی تھے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے ایک بولا یار گنوں کی کاشت کرینگے بڑا مزہ رہیگا۔ گنا کھیت سے توڑا اور چوسنے لگے۔ دوسرا بولا ہاں یار بڑا لطف رہیگا تڑاق پڑاق توڑا اور چوس لیا۔ اس پر پہلے نے بگڑ کر کہا کہ میں نے تو ایک ہی گنا توڑا تھا تو نے دو کیوں توڑ لئے دوسرا بولا ہمارا کھیت ہے چاہے سو کھاویں تو کون ہے روکنے والا۔ تو بھی کھالے۔ بس جناب ایسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ کوئی اُنسے پوچھے کہ ارے احمقو وہ گنّے ابھی ہیں کہاں جن پر لڑائی بھی ہونے لگی۔ غرض لڑائی اتنی بڑھی کہ مقدمہ قاضی کے یہاں پہونچا۔ قاضی نے اُنہیں اس حماقت کی اس طرح سزا دی کہ دونوں سے کہا کہ پہلے اس کاشت کا محصول سرکاری تو داخل کردو۔ پھر مقدمہ کی سماعت کی جاویگی۔ چنانچہ جناب اس نے پہلے تو دونوں سے محصول داخل کرالیا۔ پھر دونوں سے کہا کہ دیکھو تم وار برابر برابر گنّے توڑا کرو۔ یہ فیصلہ کر دیا۔ خواجہ صاحب نے اِیہ احقر کاتب وعظ کیطرف مزاحاً اشارہ تھا بحوالہ احقر کے سابق عہدہ ڈپٹی کلکٹری کے ۱۲ کاتب) بس اسی طرح دین کے متعلق سوال و اشکال تو بہت اور کام کے نام دم نکلتا ہے۔ حالانکہ حالت ہونا یہ چاہیئے۔ ؎

کار کن کار بگذر از گفتار
اندریں راہ کار باید کار

فرماتے ہیں شیخ شیرازی ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم
کہ اصلے ندارد دم بے قدم

؎ قدم باید اندر طریقت نہ دم
کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(چونکہ یہ شعر دوبارہ پڑھا گیا تھا۔ اسلئے دوبارہی لکھا گیا ۱۲ کاتب) خدا جانتا ہے خدا کے یہاں نہ مولویت کا دعوی کچھ کام دیگا۔ اور نہ مشیخت کام دیگی۔ اگر کام دیگا تو یہی کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردو جسکا نام ہے اسلام کامل بس یہ کام دیگا۔ اور کچھ بھی نہیں۔ تو خدا کے واسطے ہمتیں درست کر کے کامل اسلام اختیار کرلو۔ اور دشواری کے وہم سے ہمت مت ہارو۔ ذرا اختیار کرکے تو دیکھو میں قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں دیکھئے آدمی قسم جبھی کھاتا ہے۔ جب پورا بھروسہ ہو۔ ابھی سے

سمجھ لیجئے کہ مجھے کوئی تو بھروسہ ہے خود اپنا معائنہ مشاہدہ یا بزرگوں کی تقریباً تقلید کبھی چیز پر
تو اطمینان ہے جسپر میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ جتنی دشواریاں تمھیں دین میں اب نظر آرہی ہیں اگر
ارادہ کی تکمیل کرلو اور عمل شروع کر دو تو خدا کی قسم سب دشواریاں ہٹتی چلی جائیں گی۔ اسوقت
معلوم ہوگا کہ درحقیقت کوئی دشواری تھی ہی نہیں اور جو دشواریاں ہمیں نظر آرہی تھیں وہ محض
ہمارا وہم تھا اور کچھ بھی نہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں جنگل میں دیکھا ہوگا یا کسی پختہ سڑک پر
دیکھا ہوگا کہ راستہ کے دونوں طرف درخت ہوتے ہیں اور دور تک نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا
ہے کہ آگے چلکر دونوں لنیں درختوں کی ملگئی ہیں اور راستہ بند ہوگیا ہے۔ یا سمندر کی سیر کو
کبھی گئے ہوگے تو سمندر آسمان کے کنارہ سے ملا ہوا نظر آیا ہوگا اور یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ بس آگے
سمندر نہیں اب فرض کرو ایک شخص ہو بالکل ناتجربہ کار جسکو کہیں کا تجربہ نہیں نہ بر کا نہ بحر کا۔ اسکو
دریا میں لیچلے۔ ایک مقام تھا جہاں دریا کا بھی راستہ قطع کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ آسمان کے کنارہ
کو پانی سے ملا ہوا دیکھکر اور یہ سمجھکر کہ آگے چلکر راستہ بند ہے اور یہ سوچکر کہ یہ سرپوش سا کیا ڈھکا
ہوا ہے جہاز اس سے ٹکرا نہ جائیگا جہاز والے سے پوچھتا ہے کہ بھائی پہلے مجھے یہ تو بتا دو کہ کدہر
کو جائیگا جہاز۔ تم چل تو رہے ہو مگر آگے راستہ ندارد۔ اب جہاز والا ہر چند کہتا ہے کہ بھائی تم
چپکے چلے تو چلو راستہ صاف پڑا ہوا ہے۔ میرا تو بارہا کا دیکھا ہوا ہے۔ میں تو رات دن کا آنے جانے
والا ٹھیرا اور تمنے کبھی دریا کا سفر کیا نہیں اسلئے یوں سمجھ رہے ہو کہ راستہ بند ہے لیکن دراصل یہ
بات نہیں۔ تمھیں تجربہ نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ نہیں جناب پہلے ہمیں سمجھا دو تب چلیں گے کیونکہ
ہمیں تو کھلی آنکھوں نظر آرہا ہے کہ آگے چلکر راستہ بند ہے۔ خیر ابھی تو دس میل ہی آئے ہیں پھر دور
پہونچکر لوٹنا پڑا تو طوالت ہوگی۔ یہیں سے واپس چلے چلو۔ اب کیا اس احمق کے کہنے سے جہاز
والا اپنا جہاز پیچھے کو ہٹائیگا۔ یا کوئی اسی طرح ایسا احمق ہو جسکی میں نے پہلے مثال دی تھی کہ سڑک
پر دونوں لنیں درختوں کی دور سے ملی ہوئی دیکھکر یہ سمجھتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے اور اپنے
رہبر سے کہتا ہے کہ آگے چلکر تو درخت مل گئے ہیں اور راستہ بند ہو رہا ہے تم کدہر لئے چل رہے
ہو۔ وہ ہر چند کہتا ہے کہ درخت یہیں سے ملے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ وہاں ملے ہوئے نہیں ہیں۔
تم چلنا تو شروع کرو۔ رستہ ملیگا اب وہ سنتا ہی نہیں۔ اب بھلا ایسے احمقوں کا کیا علاج۔ اسی طرح

اے صاحبو ابھی تک تم نے چلنا شروع نہیں کیا ہے جبھی تک دین کے رستہ میں تمھیں پتھر اور پہاڑ نظر آرہے ہیں۔ ارے بھائی تم چلو تو پھر جتنے پتھر اور پہاڑ ہیں سب خود بخود ہٹتے چلے جائینگے اول تو اس راستہ میں پہاڑ ہیں نہیں ؎

اے خلیل اینجا شرار و دود نیست　　جز کہ سحر و خدعۂ نمرود نیست

اور جو پہاڑ تمھیں اسوقت نظر آرہے ہیں وہ حقیقی نہیں ہیں خیالی ہیں میں کہتا ہوں کہ دین میں تنگی اور دشواری اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو ایسی برکت ہے طلب کی اور اخلاص اور فنا کی اور سچے اسلام کی کہ بڑے بڑے پہاڑ ھباءً منثورًا ہوجاتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

ہائے کیا مضمون ہے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا بہانہ سے اپنے محل کے اندر لیگئی تو سات دروازے تھے اس محل کے ہر ایک دروازہ کو بند کرکے اسمیں ایک ایک قفل بھاری لگاتی چلی گئی جب ساتوں دروازے مقفل ہوچکے تب اطمینان کے ساتھ اُس نے اپنے خواہش ظاہر کی کہ اب اگر بھاگنا بھی چاہیں گے تو بھاگ کر جائیں گے کہاں اسوقت اگر وہ ایسے ہی شکی ہوتے جیسے کہ ہم لوگ ہیں اور حق تعالیٰ پر پورا توکل نہوتا تو بھاگنے کی کوشش ہی نکرتے مگر خدا پہ توکل کرکے بھاگے کہ میں اپنا کام تو کروں وہ اپنا کام کرینگے۔ جو کام میرے اختیار میں ہے وہ تو مجھے پورا کرنا چاہیئے۔ پس جناب دوڑنا تھا اور قفلوں کا خود بخود ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنا اور ٹیوں کا کھلنا غرض ایک ٹوٹا دوسرا ٹوٹا تیسرا اسی طرح ٹوٹا پھر چوتھا پھر پانچواں غرض سارے قفل ٹوٹ ٹوٹکر گر پڑے اور حضرت یوسف علیہ السلام ساتوں دروازوں کو پار کرکے باہر ہوگئے تو مولانا اسکو یاد دلاکر فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی گو نفس و شیطان سے بچکر نکلنے کا رستہ تو دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا لیکن تم خدا پر بھروسہ کرکے دوڑو تو دیکھو اللہ میاں غیب سے رستہ پیدا کرتے ہیں یا نہیں۔ ارے بھائی تم تو اپنی سی کوشش کرو۔ اور صلاح کا ارادہ تو کرو پھر کوئی اشکال پیش آوے تو پیش کرو اور کام کرنے سے پہلے تو یہ باتیں بالکل فضول ہیں مجھے ایک جواب اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ العزیز کا بہت

پسند آیا جو انھوں سے ایک طالب علم کو دیا تھا۔ دیکھئے اہل مناظرہ کے جواب اور قسم کے ہوتے ہیں اہل حقیقت کے اور قسم کے۔ اہل مناظرہ کے جواب تو بس زبان ہی تک رہتے ہیں اور اہل تحقیق کے جواب قلب تک اترتے ہیں۔ دوران درس میں ایک طالب علم نے ایک حدیث پر شبہ کیا تھا اسکا جواب مولانا نے دیا تھا۔ حدیث یہ ہے کہ جو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز ایسے پڑھے کہ لا یحدث فیہما نفسہ یعنی اُسمیں اپنے جی سے باتیں نکرے یعنی حدیث النفس کے طور پر جو ہم لوگ اِدہر اُدہر کی باتیں سوچا کرتے ہیں اُس سے وہ نماز بالکل خالی ہو بے سوچے اگر ادہر اُدہر کے خیالات آجاویں تو کچھ ڈر نہیں مگر خود نہ سوچے اور بے سوچے آنے میں کچھ حرج نہیں بشرطیکہ اُنھیں دل میں رکھے بھی نہیں یعنی احداث اور ابقاء دونوں اسکی جانب سے نہ ہوں یعنی نہ خود پیدا کرے نہ خود باقی رکھے بس متوجہ الی اللہ رہے اور اگر کوئی خیال خود بخود آجائے تو کچھ حرج نہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ نماز میں حضور بہت آسان ہی جسکو لوگوں نے خواہ مخواہ مشکل سمجھ رکھا ہے تو مولانا کی خدمت میں یہ حدیث ہو رہی تھی کہ جو ایسی دو رکعت پڑھ لیگا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ یعنی اسکے تمام گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ایک طالبعلم بولا کیوں حضرت کیا ایسی نماز ممکن ہی جسمیں خیالات نہ آویں اوّل تو اُس نے سوال ہی غلط کیا حدیث شریف میں تو یہ ہے لا یحدث فیہما نفسہ نہ کہ لا تتحدث فیہما نفسہ مگر مولانا نے اس مواخذہ سے تعرض نہ فرما کر کیا خوب جواب دیا کہ میاں کبھی ارادہ بھی ایسی نماز پڑھنے کا کیا تھا جسمیں کامیابی نہ ہوئی۔ کبھی پڑھکر بھی دیکھی تھی۔ اگر پڑھکر دیکھتے اور ناکامی ہوتی تب تو پوچھتے ہوئے بھی اچھے معلوم ہوتے۔ شرم نہیں آتی کہ کبھی ارادہ تو کیا نہیں اور پہلے ہی اعتراض کرنے بیٹھ گئے حدیث پر بھائی کبھی اس حدیث پر عمل تو کر کے دیکھا ہوتا جب قدرت نہ ہوتی جبھی اعتراض کیا ہوتا سو واقعی اسکی تو ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے پلاؤ کی تعریف کی کہ بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ یہ سنکر ایک کہتا ہے جو ہمیشہ ستو ہی گھول گھول کے پیتا رہا ہے کہ پلاؤ گلے اتریگا کیونکر یہ سیسے چاول کانٹے سے کانٹے ہے پھر لقمہ میں بہت سے اور جو پھنس جائیں تو مثلاً ایک لقمہ میں ۱۰۰ ہم چاول ایکدم سے آگئے وہ بھی کانٹے کی طرح ہے نوکدار اور حلق کا ذرا سا سوراخ۔ بھلا لقمہ اتریگا کیسے آپنے یہ بات حکیم جی سے پوچھی کہ صاحب ذرا مجھے سمجھا دیجئے

کہ پلاؤ کا لقمہ گلے سے اتریگا کیونکہ کوئی پتلی چیز ہوتی تو اتر بھی جاتی۔ اب حکیم صاحب سمجھانے بیٹھے کہ دیکھو یہ صورت اترنے کی ہوگی کہ یہاں تو یہ چاول لمبے لمبے نظر آرہے ہیں وہاں ہوکر گول ہوجائیں گے وہاں حلق کے اندر تخلخل ہوجائیگا مگر اسکی سمجھ میں ہی نہیں آتا اشکالات پر اشکالات بس سیدھا جواب یہ ہے کہ ارے احمق کھا کر تو دیکھ جسوقت اتریگا اُسی وقت پوچھئے اصلی جواب تو یہی ہے۔ حضرت ان بزرگوں کے جواب ایسے ہی ہوتے ہیں کہ پھر کسی کو کچھ گنجائش ہی کلام کی باقی نہیں رہتی سنار کی کھُٹ کھُٹ لوہار کی ایک۔ بھلا کیا منہ رہا اُس طالب علم کا کہ پھر کوئی اشکال پیش کرسکے مولانا کے جواب کے بعد۔ واللہ اگر مولانا حقیقت سمجھانے بیٹھ جاتے اس طالب علم کو تو ہزاروں شبہات پیش آتے۔ اُسکا شبہ تو کام کرنے ہی سے رفع ہوسکتا تھا۔ اُسکا شبہ علمی تقریر سے دور نہ ہوتا کیونکہ جو عملی کام ہیں اُن میں جو شبہات پیدا ہوں وہ عمل ہی کرنے سے زائل ہوتے ہیں ورنہ نری علمی تحقیقات سے کچھ کام نہیں چلتا۔ تو بزرگوں کے جواب تو جناب ایسے ہی ہوتے ہیں اور حقیقت میں صحیح جواب یہی ہیں۔ اسی طور پر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تکمیلِ اسلام یعنی اسلام کامل حاصل کرنیکا ارادہ کرلو پھر اگر ناکامی ہو تب تو کچھ اچھے بھی معلوم ہو کوئی اشکال پیش کرتے ہوئے اور ارادہ کرنا کیا مشکل ہے کرکے تو دیکھو۔ حاصل یہ کہ واقع میں ارادہ کے بعد جب دین میں کچھ دشواری نہیں اور دین ہے اسلام اور اسلام کی حقیقت ہے سپرد کرنا اور وہ ہے آسان تو بس اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردو اب یہ سمجھنا باقی ہے کہ سپرد کرنا کسے کہتے ہیں سو اسکے لئے ایک موٹی مثال عرض کرتا ہوں دیکھئے وکیل کے سپرد جو مقدمہ کردیا جاتا ہے تو اُسکے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہی معنی ہوتے ہیں کہ بس اب تم اُسمیں کوئی دخل مت دو۔ اب مقدمہ جانے اور وکیل جانے۔ اور وکیل بھی خاصکر جب کہ معتمد بھی ہو۔ کارساز بھی ہو خیر خواہ بھی ہو دانا بھی ہو قادر بھی ہو۔ بعض وکیلوں میں تو یہ بھی شبہ ہوسکتا ہے کہ کبھی شاید قانون نہ جانتا ہو شفقت میں کمی ہو۔ اور جہاں ایسا ہو جیسے بیٹے کا تو مقدمہ اور باپ وکیل یا جیسے کوئی مریض اپنے آپکو ایسے حکیم کے سپرد کردے کہ وہ طبیب بھی ہے اور باپ بھی ہے اور طبیب بھی ایسا کہ حکیم محمود خاں سے سند حاصل کئے ہوئے۔ اُسکے سپرد کردینے کیا معنی ہونگے یہ معنی ہونگے کہ تم مت دخل دو اور دخل نہ دینے کے کیا معنی ہیں کہ اگر مریض کچھ کھاوے تو حکیم جی سے پوچھے نسخہ ہوئے تو حکیم جی سے پوچھے۔ میں جب بیمار پڑتا ہوں تو ایسا کرتا ہوں کہ کوئی ایک

طبیب اپنے علاج کے لئے تجویز کر لیتا ہوں اور سپرد کرنے کے اس معنی یہ ہیں اس طرح عمل کرتا ہوں کہ اگر اور کوئی بھی کچھ بتلاتا ہے کیونکہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب محبت ہوتی ہے تو نفع کی چیز بتانے کو ہر شخص کا جی چاہتا ہی ہے تو میں کسی کی دلشکنی نہیں کرتا۔ کہدیتا ہوں کہ بھائی فلانے حکیم میرے معالج ہیں تم ان سے کہدو انہیں سمجھادو۔ اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو مجھے بھی کوئی عذر اسکے استعمال میں نہ ہوگا اگر ایسا نہ کروں تو میں کس کس کا علاج کروں کیونکہ محبت میں ہر ایک شخص کچھ نہ کچھ ضرور بتلانے لگتا ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں ضرورت اسکی ہے کہ ایک خدا کو اختیار کرو ہم نے بجائے اللہ اختیار کر رکھے ہیں کہیں نفس کہیں برادری کہیں قوم کہیں روپیہ کہیں کچھ کہیں کچھ۔ سبکو راضی نہیں کر سکتے بس ایک کو لیلو ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار | بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

اور یہ مشرب ہونا چاہیئے مسلمان کا ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے | چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بہ کس نگاہے

اور یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند | دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور حضرت خدا کے ساتھ تو یہ علاقہ کیوں نہ ہونا چاہیئے لوگوں نے تو مخلوق کے ساتھ یہ علاقہ پیدا کر لیا ہے۔ اب آخر مجنوں کا قصہ معلوم ہی ہے سبکو لیلیٰ مورخین نے بھی لکھا ہی کہ سانولی تھی۔ بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن دل ہے۔ جہاں آگیا۔ ایک حکایت مولانا نے لکھی ہے ؎

گفت لیلیٰ را خلیفہ کان توئی | کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

بادشاہ وقت نے جب لیلیٰ کی تعریف سنی تو حکم دیدیا کہ بلالو۔ چنانچہ وہ حاضر کیگئی دیکھا تو ایک سانولی سی عورت۔ کہا ماشاء اللہ آپ ہی ہیں جنھوں نے مجنوں کو پریشان کر رکھا ہے ؎

از دگر خوباں تو افزوں نیستی | گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

یعنی اوروں سے زیادہ تو کوئی بات تجھ میں نہیں معلوم ہوتی۔ لیلیٰ نے کہا چپ رہ تو مجنوں تھوڑا ہی ہے ؎

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا | ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

اگر تیرے پاس مجنوں کی آنکھ ہوتی تو اسوقت تیری نظروں میں دونوں عالم بیقدر ہوجاتے تو حضرت جسکا حُسن ادنیٰ درجہ کا ہے اُسکی محبّت میں تو طالب کی یہ حالت ہوجائے کہ دونوں عالم اُسکی نظروں میں بیقدر ہوجائیں اور آپ خدا کی محبت میں اتنی حالت بھی نہ کر دکھلادیں افسوس ؎

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہرِ او اولیٰ بود

کیونکہ عشق کا مدار حُسن ہے اور حُسن کہاں خدا کا کہاں لیلیٰ کا حُسنِ مجازی تو ایک پرتو ہے حُسنِ حقیقی کا سو دنیا کا سب حُسن وجمال وہیں کا ظل ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ایک عارف ؎

حُسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ   پس بچشمِ عاشقاں خود را تماشا کردۂ

تو ایسی حالت میں غضب کی بات ہے کہ خدا کے ساتھ وہ علاقہ نہ ہو جو مجنوں نے لیلیٰ کے ساتھ کرکے دکھادیا۔ یعنی اپنے کو ہمہ تن فنا کردیا محبّتِ لیلیٰ میں حقیقت میں سپرد کرنا وہی ہے جسکو فنا ہوجانا کہتے ہیں۔ تو ضرورت اسکی ہے کہ ہر مسلمان فنا ہوجائے۔ فنا ہوجانیکے یہ معنی نہیں کہ سنکھیا کھالے گلا گھونٹ لے۔ مرجاوے۔ اجی حضرت وہ تو چیز ہی اور ہے۔ وہ کیا چیز ہے وہ تو ایک ہی کا ہو رہنا ہے ایک ہی کی سپردگی میں اپنے آپ کو دیدینا ہے ایک ہی کی اطاعت اختیار کرلینا ہے۔ پھر بھلا اس فنا میں مرنا کہاں بلکہ اسکا تو یہ اثر ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

اور اس فنا کی تو یہ حالت ہے ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   انچہ در وہمت نیاید آں دہد

تو فنا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرجاؤ بلکہ یہ معنی ہیں کہ اپنی رائے کو چھوڑ دو۔ اپنے ارادہ اور خواہش کو چھوڑدو۔ وہ حالت کرلو جیسی کہ حضرت عارف شیرازی نے بیان فرمائی ؎

فکرِ خود و رائے خود در عالمِ رندی نیست   کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اب بھلا رائے کا چھوڑ دینا بھی کوئی مشکل کام ہے۔ بلکہ اس میں تو بڑی راحت ہے لیجیے صاحب یہ ہے دین اور یہ ہے اسلام جو مطلوب ہے جسکو لوگ مشکل مشکل کہہ رہے ہیں کسقدر آسان نکلا بس اسکی تعلیم کرنے میں لوگ ہم ملانوں کو بدنام کرتے ہیں کہ تشدد کرتے ہیں مشکل کام بتلاتے ہیں

اسی کی تعلیم کرتے ہیں لوگ ہم میں طرح طرح کے عیب اور نقصان نکالتے ہیں واقعی ہم میں ایک عیب ضرور ہے کہ ہمنے خدا کے دین کو بہت آسان اور مختصر کرکے مخلوق کے سامنے پیش کردیا ہے کہ ادنیٰ توجہ سے ہر شخص کو دسترس ہوجاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل ہے یا آسان ہے اور کرنے سے پہلے یہ سارے خوف اور وہم ہیں اسکی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی مریض کو طبیب نے علاج کی رائے دی اب اسکو حقیقت تو معلوم نہیں علاج کو دشوار سمجھکر کہتا ہے کہ حضرت کہاں دوائیں لاؤں کہاں اہتمام کروں کہاں بکھیڑا کروں وہ حکیم کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تم نے کبھی علاج کیا نہیں اچھا تم اپنے آپکو ہمارے سپرد کردو اور تندرستی لیلو۔ اُس نے کہا اچھا صاحب سپرد کردیا۔ سپرد کرکے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی چیز ایسی نہیں تجویز کی جو مشکل ہو۔ نسخہ بھی وہ لکھا جو شہر میں ملتا ہے غذا بھی وہ بتائی جو شہر میں ملتی ہے۔ نسخہ کے دام بھی وہ جو وسعت سے زیادہ نہیں کیونکہ کامل طبیب مفردات سے علاج کرتا ہے یا دو تین اجزا سے اور معمول کے مطابق جو غذا مریض کھاتا ہے اُسی کو برقرار رکھتا ہے البتہ اُسمیں کچھ اصلاح کردیتا ہے۔ ایسا طبیب اتفاق سے اُس مریض کو ملگیا۔ آٹھ دس دن ہی علاج کیا تھا کہ نہ بخار رہا نہ کھانسی رہی۔ بالکل تندرست ہوگیا۔ طبیب نے پوچھا کہو بھائی تم تو کہتے تھے کہ علاج بڑا مشکل ہے۔ کہا میری حماقت تھی میں نے باقاعدہ علاج کبھی کیا نہ تھا سُن سُن کر اوہام میں مبتلا ہوگیا تھا یہ تو بڑا آسان نکلا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسی طرح اپنے آپکو خدا کے سپرد کرکے دیکھو کتنا آسان ہے سارا قصہ البتہ یہ ضروری ہے کہ خواہ علاج کتنا ہی آسان ہو مگر عادات و معمولات میں کچھ نہ کچھ ترمیم ضرور کیجاتی ہے مگر وہ بھی دشوار نہیں ہوتی۔ جیسے مشفق طبیب یوں تو نہیں کہتا کہ تم بیوی کو طلاق دیدو بچوں کو چھوڑ دو۔ مال اسباب کو خیرات کرڈالو سب حالت بدستور رہنے دیتا ہے ہاں معمولات میں تھوڑی سی دست اندازی کرتا ہے جب مشفق طبیب ایسا کرتا ہے تو حق تعالیٰ کی برابر تو نہ ماں رحیم ہے نہ باپ اُن کی تجویز تو سب ہی سے زیادہ سہل ہوگی چنانچہ دیکھ لیجئے حق تعالیٰ نے جو احکام ہمارے لئے تجویز فرمائے ہیں خود انھیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری کسقدر سہولت اور رعایت مدنظر رکھی ہے۔ مثلاً یہ تو سبکو معلوم ہے کہ اگر پانی نہ ہونیکی وجہ سے غسل یا وضو نہ ہوسکے اور سونے سے وضو یا سوتے ہوئے احتلام ہوجانے سے غسل واجب ہوگیا تو تیمم کی اجازت ہوتی ہے لیکن اسمیں ایک بات کمال کی ہے یعنی عجیب قصہ ہے کہ اگر سفر میں

پانی وضو کے لائق تو ہو لیکن غسل کے لایق نہ ہو یا پانی موجود ہو لیکن پانی سے غسل کرنا مضر ہو تو ظاہراً عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے وقت میں صحبت کی اجازت نہونی چاہیئے کیونکہ خواہ مخواہ بیوی سے مشغول ہو کر قصداً تو ناپاک بنے اور اب پانی ڈھونڈھتے ہیں تو ملتا نہیں یا ملتا ہے مگر عذر ضرر کا کرتے ہیں پھر پوچھتے ہیں کہ صاحب تیمم جائز ہے یا نہیں۔ ایسے موقع پر شریعت کو حق تھا کہ کہدیتے کہ تمھیں قصداً ناپاک بننے کو کس نے کہا تھا جاؤ ہم تیمم کی اجازت نہیں دیتے۔ سر کھاؤ اپنا۔ مرو۔ جسوقت پاک تھے اسوقت معلوم تھا کہ پانی غسل کے لائق نہیں ہے یا غسل مضر ہو گا پھر ضرورت کیا تھی خواہ مخواہ مجبور بننے کی۔ ہم اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ دنیا میں اسکی نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے رخصت مانگی اپنے آقا سے اُس نے ذرا انکار کیا تو جھٹ ایک دوا ایسی پی لی جس سے بخار چڑھ آیا آقا کو پتہ لگ گیا کہ اس نے قصداً بغرض حصولِ رخصت بخار چڑھا لیا ہے۔ اُس نے صاف انکار کر دیا کہ ہم کبھی تمکو رخصت نہ دینگے۔ دیکھیئے دنیا میں تو یوں واقع ہو رہا ہے اور عقل کے بھی خلاف یہ بات نہیں لوگ بہت عقل عقل کرتے پھرتے ہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمھاری رائے اور عقل جسکے تم بڑے معتقد بن رہے ہو تمھاری دشمن ہے چنانچہ مثال مذکور میں عقل صحبت کی اجازت نہیں دیتی مگر شریعت نے عقل کے تشدد کو پسند نہ کر کے سہولت کا مشورہ دیا اس آیت میں یہی مضمون ہے واعلموان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم یعنی اگر رسول تمھارے کہنے کے موافق کرتے تو تم مشقت میں پڑ جاتے وجہ یہ ہے کہ یہی ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے مصلحت کیا ہے۔ غرض خدا رسول کے احکام میں ہماری ہر طرح کی مصلحت اور رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے ایسی کہ خود ہماری عقل بھی اتنی رعایت تجویز نہیں کرتی۔ تو حضرت عقل کو چھوڑیئے اسکی بڑی پرستش کرتے تھے مگر دیکھیئے عقل کا فتویٰ اس موقع پر یہ ہے کہ تیمم کی اجازت نہو کیونکہ جب پانی موجود نہ تھا یا مضر تھا تو قصداً اپنے اوپر غسل واجب کیوں کیا۔ اب شریعت کا فتویٰ سنیئے۔ مثلاً ایک ایسا ہی شخص پوچھتا ہے کہ ایسی صورت میں غسل کا تیمم کر کے نماز پڑھنا مجھے جائز ہے۔ شریعت کا نائب کہتا ہے ہاں ہاں جائز۔ وہ پوچھتا ہے کہ ایک شخص کو یہ معلوم تھا کہ پانی نہیں ہے باوجود اسکے اُس نے اپنی بیوی سے مشغول ہو کر اپنے اوپر غسل واجب کر لیا کیوں جی اسکو کچھ گناہ ہوا کچھ کراہت ہوئی۔ وہ کہتا ہے بالکل نہیں۔ وہ پوچھتا ہے کیوں صاحب

تمہیں کچھ نقصان رہے گا۔ وہ کہتا ہے بالکل نہیں۔ یہ میں نے ایک چھوٹا سا نمونہ بتایا ہے اسی سے اندازہ کر لیجئے شفقت کا پھر بھی اگر اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد نہیں کرتے تو کون آویگا جسکے سپرد اپنے آپ کو کر دوگے۔ غرض جسطرح طبیب کے سپرد اپنے آپ کو کر دیتے ہو اسی طرح اپنے آپکو خدا کے سپرد کر دو۔ یعنی اب تو یہ ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا اسمیں تھوڑا سا تصرف کرنا ہوگا۔ میں بہت چھوٹی سی بات بتلاؤنگا تفصیل آپسے آپ وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہے گی۔ میں ایسا گر بتلاؤنگا جس سے ہر وقت ذہن میں تفصیل کے جمع رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی تفصیل خود بخود وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہے گی۔ وہ گر یہ ہے کہ اب تو یہ ہے کہ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہو۔ جو جی میں آتا ہے کہہ سن لیتے ہو جو جی میں آتا ہے کھا پہن لیتے ہو جو جی میں آتا ہے خرید بیچ لیتے ہو۔ اب تو یہ حالت ہے اور فنا کے یہ معنی ہیں کہ جو جی میں آیا اُسے فوراً کرنے نہ بیٹھ جاوے بلکہ ذرا رُکے یعنی جب کسی کام کے کرنیکا ارادہ دل میں پیدا ہو اُسے فوراً نکرو بلکہ اُسکا حکم پوچھو حاملانِ شریعت سے کہ وہ کیا کہتے ہیں سو پوچھنے پر معلوم ہوگا کہ شریعت نے یہ نہیں کہا کہ گوشت گھی مت کھاؤ نکاح مت کرو بچوں کو پیار مت کرو۔ کیا کہا ہے فقط یہ کہا ہے کہ وہ کام نکرو جس میں تمھارا ضرر ہے۔ مگر اسکا فیصلہ تمھاری رائے پر نہیں رکھا۔ اگر بچہ کی رائے پر ماں باپ اُسے چھوڑ دیں تو اسکا نتیجہ بچہ کی ہلاکت ہے مثلاً بچہ نے سانپ کو دیکھا کہ چمکتا ہوا اور منقش ہے وہ اُسکی ظاہری خوبصورتی اور نقش و نگار کو دیکھکر اُسکے پکڑنے کیلئے لپکا۔ باپ ہر چند اُسے روکتا ہے لیکن نہیں مانتا ہٹتا ہے لیکن اصرار کرتا ہے جب کسی طرح نہ مانا تو زور سے ایک چپت لگایا۔ اور زبردستی پکڑ کر گھسیٹ لیگیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اُس نے جو یہ دھول مارے آیا یہ رحمت اور شفقت ہے یا تشدد اور بیرحمی ہے اور اگر فرض کرو اتفاق سے اُس بچہ کو اپنی رائے پر عمل کرنیکی وہ باپ اجازت دیدے تو ظاہر ہے کہ سانپ اُسے کاٹ لیگا اور وہ مر جاوے گا۔ تو پہلی صورت میں گدھے سے گدھا بھی کہیگا کہ سبحان اللہ کیا مہربان باپ ہے۔ بڑی نگرانی اور بڑی محبت سے اپنے بچہ کو پالا ہے اور اگر بچہ کے کہنے پر کہ سانپ کو پکڑونگا باپ نے اجازت دیدی اور کہہ دیا کہ ہاں پکڑلے بیٹا اور بچہ کا دل نہ دُکھایا تو کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی اسکو مہربانی نہ بتلاویگا بلکہ سب یہی کہیں گے کہ محبت یہی تھی کہ چپت لگاتا اور سانپ نہ پکڑنے دیتا۔ وہ ظالم تھا دُشمن تھا خونخوار تھا باپ نہ تھا۔ پھر خدا کو جو کہ باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے آپ چاہتے

ہیں کہ جو ڈاکو باپ نے کیا وہی وہ کرتا یعنی ہمیں اجازت دیدیتا کہ جو جی میں آوے کرو۔ اب انصاف
کے ساتھ فیصلہ اپنے نفس سے کرو کہ کونسی صورت مہربانی کی ہے آیا یہ کہ کبھی کبھی چپت لگا دیا
کریں وہ بھی جب کہنا نہ مانو اور اگر کہنا مانو تو پیار پر پیار محبت پر محبت۔ اور وہ مار بھی شفقت ہی
مگر جیسا نہیں۔ تو یہ ہے وہ گر۔ گویا سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہے۔ یہاں غالباً آپ ایک شبہ
یہ پیش کریں کہ جب ہماری مرضی کے موافق نہ ہوں گے تو ہمیں تکلیف ہوگی اور ہمارا حرج ہوگا
مگر حضرت ذرا ٹھیر کر اور سوچکر کہئے جو کچھ کہنا ہو۔ اول تو ہر جگہ یہ کہنے کا منہ نہیں کہ تکلیف اور حرج
ہوگا مثلاً اچھی بھلی داڑھی فراصفا چٹ کردیں گو کہ معلوم ہوں گی حسین معلوم ہوں گے تو میاں تمہاری یہ اگر شریعت کی حمایت پر عمل کیا تو
کونسی تکلیف ہوئی کونسا حرج ہوا البتہ ایک تاجر تو خیر کہہ سکتا ہے کہ سود چھوڑ دوں تو مالی حرج ہوگا یہ تو خیر کچھ معقول بھی ہے
گو انشاء اللہ اسکا جواب بھی ایسا بتلادونگا جس سے یہ اعتراض گول ہو جاویگا مگر خیر ظاہر تو کچھ ہے لیکن شریعت
اگر داڑھی منڈانیکو منع کرے شریعت اگر غیبت کو منع کرے شریعت اگر انگریزی لباس پہننے سے
منع کرے تو اسمیں کونسا ضرر ہو گیا۔ اگر اسمیں مدعی تکلیف اور حرج کا ہو تو میں کہتا ہوں اس کا
نام بتا دیجئے کہ وہ تکلیف اور حرج کیا ہے۔ اگر تکلیف اسکو کہتے ہو کہ خیال کے خلاف ہے تو حضرت
یہ جو گورنمنٹ کی نوکری ہے یہ تو اسمیں بھی ہے کہ آفس میں جانا ہے لیکن بارش ہو رہی ہے
تو نوکری بھی مت کرو۔ دنیا کا کونسا ایسا کام ہے جو نفس کے بالکل خلاف نہو۔ خلاف تو ہزاروں
باتیں ہیں مثلاً تار آیا کہ بیٹا بیمار لیکن کچہری جانا ضرور۔ یہ بھی تو نفس کے خلاف ہے مگر وہاں کبھی اعتراض نہیں کرتے۔ قانون ہی
تو یہ کہتا ہی کہ کیسا ہی بیٹا ہو مگر حاضر ہونا پڑیگا اس کو کوئی نہیں کہتا کہ کیسا سخت قانون ہے کہ ہم بیمار گھر میں بیٹھے
ہوں اور وہاں سے فوراً یہ حکم چلا آرہا ہو کہ آؤ جی گھر سے نکلکر تو جناب ایسا قانون تو کوئی دنیا میں بھی نہیں
جسمیں نفس کے خلاف کوئی بات بھی نہو پھر نہیں معلوم اللہ میاں کے قانون ہی کو کیوں ہر بات
میں سخت بتایا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت نے داڑھی منڈانے سے منع کر دیا تو اسمیں
تکلیف اور حرج کیا ہو گیا کہیں چوٹ لگ گئی (بلکہ منڈانے میں تو استرہ لگ جانیکا خوف بھی
ہے ۱۲ کاتب) آمدنی گھٹ گئی سردی لگنے لگی گرمی لگنے لگی کیا ہو گیا۔ ہاں یہ تو ہوا کہ بزعم تمہارے
صورت اچھی نہ رہے گی سو اول تو یہ ضرور نہیں کہ داڑھی سے صورت بری معلوم ہونے لگتی ہو
داڑھی کوئی ورم ہے کہ چہرہ پر بری معلوم ہو لاحول ولا قوۃ بلکہ واقعی اگر شریعت کی حد میں ہو تو

چہرہ کی زینت ہے یوں کوئی ایڑی تک بڑھالے یہ اُنکی ہمت ہے۔ اختیار ہے باقی شریعت نے مجبور صرف ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنے پر کیا ہے۔ اور ایک مٹھی ڈاڑھی تو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم کہتے ہیں کہ خوبصورت نہ بھی معلوم ہو تو کسکی نظر میں خوبصورت نہیں معلوم ہوتی صرف چند احمقوں کی نظر میں باقی جسکے ساتھ اصل تعلق ہے یعنی حق سبحانہ تعالیٰ انہیں تو خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ بلا تشبیہ اگر کسی بازاری عورت پر کوئی جنٹلمین صاحب عاشق ہوجائیں اور وہ عورت یوں کہے کہ تم ڈاڑھی نہ منڈایا کرو مجھے تو ڈاڑھی اچھی معلوم ہوتی ہے تو اگر وہ صاحب سچے عاشق ہیں تو خدا کی قسم اسی دن سے ڈاڑھی منڈانا چھوڑ دینگے۔ اب اُنکے دوست احباب ہنستے ہیں کہ آئیے مولوی صاحب آئیے ملاں صاحب لیکن وہ عاشق صاحب بجائے متاثر ہونیکے یہ کہہ دیتے ہیں کہ میاں تم کیا جانو اس ڈاڑھی کی حقیقت مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی ہو لیکن اُسے تو اچھی معلوم ہوتی ہے جسپر میں جان تک فدا کرنیکو تیار ہوں مجھے اب کسی سے کیا مطلب اب تو میں نے یہ مذہب اختیار کرلیا ہے ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

ابتو میری حالت اُس نوخرید غلام کی سی ہے جس سے اسکے نئے آقا نے اُسکا نام اور کھانے پہننے کے متعلق معمول پوچھا تھا اور اُس نے اپنے آقا کے پوچھنے پر یہ جواب دیا تھا کہ ابتک تو جو کچھ بھی میرا نام ہو لیکن آج سے تو جو تم مجھے کہنے لگو وہی میرا نام ہے جو پلاؤ وہی میرا پانی ہے جو کھلاؤ وہی میری غذا ہے جو پہناؤ وہی میرا لباس ہے۔ اسی طرح اُس بازاری عورت کیلئے وہ عاشق ڈاڑھی پر ہنسنے والوں سے کہہ دیگا کہ میاں اُسے تو پسند ہے تم بلا سے بُرا سمجھتے رہو۔ تم سے مجھے لینا کیا ہے حضرت یہی مذہب ہوتا ہے عاشق کا ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں   مانمی خواہیم ننگ و نام را

مگر اس سے پہلے اسکی ضرورت ضرور ہے ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را   خاک بر سر کن غم ایام را

یعنی جام محبت پینے کے بعد یہ مذہب نصیب ہوجاتا ہے اُس سے ہی تمام شبہات تمام خدشات تمام سوالات تمام اشکالات رخصت ہوجاتے ہیں اور پھر قال و قیل سی کچھ نہیں ہوتا

آج کل قیل وقال اور بحث وجدال اور وہ بھی محض فضول ولاطائل کا ایک مستقل شغل ہو گیا ہے
چنانچہ ایک بڑے تعلیمیافتہ فرماتے تھے کہ فروری میں روزے مقرر ہوتے تو بہت مناسب تھا
گرمی کے دنوں میں جو روزے آجاتے ہیں بڑی مصیبت ہو جاتی ہے اللہ اکبر کچھ حد ہے ۱۶ گھنٹہ
تک پیاسا رہنا پڑتا ہے۔ اس دشمن عقل نے یہ نہ سمجھا کہ فروری کے مہینہ میں تمام اقلیموں
میں تو دن چھوٹا نہیں ہوتا۔ ابتو نرمی سختی سبکو بانٹ رکھی ہے۔ نمبر وار سب بھگتو مگر اس سے بھی
قطع نظر کرکے کہتے ہیں کہ ہمکو ضرورت ہی کیا اعتراض کرنیکی جو چاہا اللہ میاں نے مقرر کر دیا اگر
اس معترض کے قلب میں محبت ہوتی تو اعتراض کا انہیں گذر تک نہ ہوتا ایک مجمع تھا تعلیم یافتوں
کا انہیں میں نے یہ مضمون بیان کیا تھا کہ خدا سے محبت پیدا کرو سارے شبہات جاتے رہیں
گے۔ خدا کی قسم یہی اصل علاج ہے شبہات کا کیونکہ قاطع وساوس صرف محبت ہے اور کوئی چیز
نہیں۔ نہ دلائل ہیں نہ براہین ہیں نہ لکچر ہیں نہ تقریر ہے نہ وعظ ہے بس شبہات کی جڑ جو کٹتی ہے
تو محبت ہی سے۔ فرض کرو ایک بازاری عورت پر کوئی جنٹلمین صاحب عاشق ہو گئے جنکے پاس
کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے نکٹائی بھی ہے۔ اس نے ان کے لئے ایک ایسی پوشاک تجویز کی جسمیں
سوائے نکٹائی کے اور کچھ بھی نہیں یعنی اس نے کہا کہ میں جب ملونگی جب اپنے یہ سب کپڑے
اتار کر اور صرف ایک لنگوٹا باندھ کر ایک بازار سے دوسرے بازار تک ننگ دھڑنگ دس چکر
لگاؤ گے۔ اگر عاشق ہے تو اس سے بھی زیادہ پر آمادہ ہو جائیگا اور یہی نہیں بلکہ شبہ بھی نہ ہوگا
حالانکہ شبہ تو ہونا چاہیے تھا کہ کیوں بی اسمیں تمہارا کیا نفع۔ میری تو رسوائی اور تمہارا کچھ نفع
نہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمنے نماز نہ پڑھی تو اللہ میاں کا کیا بگڑا مگر یہاں کوئی نہیں بولتا۔
اتفاق سے ایک تم سے عاقل تھے بڑے فلسفی تھے آپ پوچھتے ہیں بی مجھے رسوا کرنے میں تمہارا
کیا بھلا ہوگا۔ وہ کہتی ہے کہ خیر اگر تمہیں یہ رسوائی گوارا نہیں تو جاکر گھر بیٹھو۔ اب خوشامدیں
کر رہے ہیں کہ نہیں نہیں خفا مت ہو خفا مت ہو میں نے تو یوں ہی حکمت دریافت کر لی تھی ورنہ
مجھے حکمت معلوم کرکے کیا لینا مجھے تو تمہاری رضامندی چاہئیے۔ تو جناب اس مردار کے کہنے
میں اول تو شبہ ہی نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو اس سے فوراً رجوع کرکے عمل کرنا شروع کر دیگا۔ تو وجہ فرق
کی کیا وجہ فرق کی یہ ہے کہ اس کمبخت سے محبت ہے اور اللہ میاں سے محبت نہیں۔ بلکہ اگر

کوئی دوسرا اس شخص کو مشورہ بھی دے کہ میاں یہ تو نہایت واہیات اور بیہودگی کا کام ہے اسکی حکمت اور مصلحت تو پوچھ لی ہوتی۔ تو وہ یہی کہدیگا کہ میاں جاؤ یہ کوئی پوچھنے کا موقع ہے یہ تو فنا کا موقع ہے جو کہے کرنا چاہیئے۔ حکمت کیا ہوتی۔ حکمت کو تو وہ جانے جس نے تجویز کی ہے ہمیں تو حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ ہائے ہائے یہ مذہب ہمارا خدا کے ساتھ کیوں نہیں خلاصہ یہ کہ خدا کے ساتھ محبت نہیں ہے ورنہ کوئی حکم گراں نہ معلوم ہوتا ساری کم ہمتی اسی سے ہے کہ محبت نہیں ہے۔ اگر وسوسے دور کرنے ہیں تو محبت پیدا کرو۔ پھر یہ شبہ پیدا نہ ہوگا کہ اگر ہم اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینگے تو کام اٹکے گا۔ اول تو ہر جگہ یہ سوال نہیں ہو سکتا مثلاً ڈاڑھی رکھنے میں کونسا کام اٹکتا ہے۔ اور اگر کہیں کہیں یہ شبہ ہو بھی سکتا ہے کہ اگر ہم ایسا کرینگے روٹیاں نہ ملیں گی تنگی پیش آئیگی۔ تو اس شبہ کا ایک جواب تو یہ ہے کہ محبت پیدا کرلو اگر محبت پیدا کرلوگے تو خدا کی قسم تمہارا یہ مذہب ہو جائیگا کہ ع متاعِ جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے جان جیسی پیاری چیز بھی دینے پر تیار ہو جاؤ گے حضرت اب اس سے بڑھکر کوئی چیز نہیں۔ کیرانہ میں ایک طالب علم اسی شہر کے مولانا فتح محمد صاحب سے مثنوی شریف پڑھنے آئے تھے انھوں نے ایک سوال کا ایسا ہی جواب دیا تھا اور وہ عاشقانہ جواب ہے۔ اور ایک اور بھی ہے جسے میں بعد کو عرض کرونگا صرف اسی عاشقانہ جواب پر اکتفا نہ کرونگا۔ کبھی کوئی یوں کہنے لگے کہ یہ کام ہمارے کرنیکا نہیں۔ مولوی لوگ ہی ایسی ہمت کر سکتے ہیں۔ بہرحال مولوی صاحب نے اس طالب علم سے پوچھا کہ بھائی روٹیوں کی کیا فکر کروگے۔ اس نے کہا اجی مولوی صاحب روٹیوں کی کیا فکر۔ اللہ میاں کی جان ہے اگر وہ اسی دنیا میں رکھنا چاہیں گے خود روٹیاں دینگے۔ اور اگر نہیں دینگے اپنی جان لے لیں گے۔ یہ آخر کبھی نہ کبھی تو نکلے ہی گی۔ اسکی کیا فکر۔ چھوڑیئے اس قصہ کو۔ ہمت تو دیکھئے آپ مرنے پر تیار ہو گئے کہ کبھی نہ کبھی تو مریں ہی گے ابھی سہی۔ جیسے کسی ملاح سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے تھے اس نے کہا دریا میں۔ پوچھا دادا۔ کہا دریا میں۔ کہا میاں تمہیں ڈر نہیں معلوم ہوتا کہ اتنے تو تجربے ہو چکے ہیں پھر بھی تم یہیں نوکری کرتے ہو۔ اسوقت تو اس نے صرف یہ کہکر ٹالدیا کہ صاحب کیا کریں باپ دادا سے یہی پیشہ چلا آتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اس سے پوچھا کہ آپکے والد صاحب نے کہاں انتقال فرمایا تھا کہا گھر میں۔ پوچھا دادا صاحب نے

دوسرا جواب ۔۔ غضب کی بات ہے اس جملہ سے شروع ہو کہاں تک ... کو چھوڑ دو

کہا گھر میں۔ پوچھا پردادا صاحب نے۔ کہا گھر میں۔ کہا پھر آپ کو ڈر نہیں معلوم ہوتا کہ جس گھر میں آپ کے اتنے بزرگ مرتے چلے آئے ہیں اسی میں آپ رہتے ہیں حاصل یہ کہ مرنا تو ہے ہی۔ دریا میں مرے تب کیا۔ اور گھر میں مرے تب کیا۔ اور مصر و شام میں مرے تب کیا۔ اسی طرح فاقہ میں مرے تب کیا۔ تو اس طالب علم کا یہ مذہب تھا۔ صاحب کچھ استغنا میں اثر ہوتا ہے جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی ایک صاحب مولوی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جو یہ گفتگو سنی تو ان پر اثر ہو گیا۔ سمجھے کہ یہ تو بڑا اچھا آدمی ہے۔ انکا جی چاہا کہ کچھ خدمت کروں۔ کہا کہ مولوی صاحب آج میرے یہاں آپ کی دعوت ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اچھا بھائی مگر میں مکان پر نہ آؤنگا۔ میرا حرج ہوگا۔ اگر کھلانا ہو تو کھانا یہیں بھیج دینا۔ اب آپ نے انمیں بھی نخرے شروع کیے۔ حالانکہ دعوت کا عموماً یہ دستور ہے کہ مہمان خود میزبان کے گھر جا کر کھانا کھاتا ہے۔ لیکن ان کے اس عذر کو بھی قبول کر لیا گیا کہ اچھا صاحب ہم یہیں کھانا حاضر کر دینگے۔ پھر تو جناب اس واقعہ کا قصبہ بھر میں چرچا ہو گیا کہ یہ طالب علم ایسے ہیں۔ بڑے سیر چشم ہیں۔ پھر تو صبح بھی دعوت شام بھی دعوت اور دعوت کا کھانا عموماً روزمرہ کے کھانے سے اچھا ہوتا ہی ہے۔ غرض خوب دعوتیں اڑائیں جتنی مثنوی پڑھی یار دعوتیں ہی اڑاتے رہے جب پڑھ چکے السلام علیکم کہکر یہ جا وہ جا۔ میں پوچھتا ہوں اسکو کہاں سے روٹیاں ملگئیں لیکن اس جواب کو جو آزاد ہوگا وہ تو قبول کر لیگا۔ اور جو آزاد نہ ہوگا وہ کہیگا کہ واہ واہ صاحب واہ اچھی رائے دی۔ اور جو کوئی نہ پوچھے تو بھوکوں ہی مر جاؤ۔ جیسے ایک واعظ بیچارے یہ بیان کر رہے تھے کہ پل صراط بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے ایک فارسی صاحب بھی کہیں وعظ میں بیٹھے تھے۔ آپ فرماتے ہیں ملا صاف بگو کہ راہ نیست۔ مولوی صاحب پھر صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہاں چلنے کا رستہ ہی نہیں۔ اس ہیر پھیر سے کیا حاصل کہ تلوار سے بھی تیز بال سے بھی باریک یوں کہو کہ وہاں چلنے کا رستہ ہی نہیں۔ اسی طرح صاحب اس جواب کو سنکر آپ صاحبان بھی کہتے ہوں گے کہ مولوی صاحب نے اچھی رائے دی۔ پھر سب کو زہر دے دیکر اور گلا گھونٹ گھونٹ کر ہی کیوں نہ ختم کر دو۔ تڑس تڑس کر مرنے سے تو یہی اچھا کہ ایکدم سے جان نکل جائے۔ اچھی رائے دی صاحب کہ تجارت اور کاروبار سب چھوڑ کر بیٹھے رہیو اور بس مر رہیو۔ کوئی نہ کوئی دفن کر ہی دیگا

بھائی ہماری سمجھ میں تو یہ جواب آیا نہیں سو دوسرا جواب اور بھی ہے مگر وہ بھی پسند نہ آئیگا وہ
یہ کہ شان و شوکت کو چھوڑ دو اور کوئی ایسا کام جو حلال ہو اُسکو اپنا ذریعہ معاش بناؤ یہ کوئی
بے عزتی کی بات نہیں۔ دیکھو حضرت داؤد علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام زرہ بنایا کرتے تھے
جو لوہار کا کام ہے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ ڈپٹی کلکٹر ہی ہو جاویں ملک التجار ہی ہو جاویں۔
ملک النجار ہی سہی۔ نجار یہ یاد آیا حدیث شریف میں ہے کان زکریا نجاراً حضرت زکریا
علیہ السلام نجار تھے یعنی بڑھئی کا کام کیا کرتے تھے۔ مردوں کو انبیا علیہم السلام کی تقلید سے
عار نہ آنی چاہیئے اور عورتوں کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تقلید کو اپنا فخر سمجھنا چاہیئے جو
باوجود اسکے کہ صاحبزادی تھیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم شاہِ دو عالم کی لیکن چکی
پیسا کرتی تھیں یہانتک کہ آپ کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے تھے۔ ایک روز حضرت علی
کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے اُنکی یہ حالت دیکھکر کہا کہ سنا ہے کچھ غلام لونڈی تقسیم ہونے کیلیئے
آئے ہیں تم بھی گھر کے کام کاج کیلیئے کوئی لونڈی اپنے ابّا سے مانگ لاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ
عنہا دولت خانہ پر حاضر ہوئیں لیکن حضور اُسوقت تشریف نہ رکھتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ
عنہا موجود تھیں اُن سے کہکر چلی آئیں جب حضور کو واپسی پر اطلاع ملی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ
کے مکان پر خود تشریف لائے۔ اور آکر حضرت فاطمہ رضہ کے پاس بیٹھ گئے عشا کے بعد کا وقت تھا
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ اُٹھنے لگیں آپنے فرمایا لیٹی رہو۔ آخر صاحبزادی
تھیں بے تکلف لیٹی رہیں حضور نے دریافت فرمایا کہ کیسے آئی تھیں کیا کام تھا۔ اب وہ تو مارے
شرم کے کچھ عرض نہ کر سکیں چپ رہیں۔ اسقدر شرمائی تھیں کہ دنیا کے نام لینے کی بھی ہمّت
نہ ہوئی آخر حضرت علی رضہ نے جو مقصد تھا عرض کیا۔ آپنے فرمایا کہ لونڈی دوں یا اس سے بھی
اچھی چیز دیدوں۔ دیکھیئے حضور نے اپنی اولاد کے واسطے کیا اختیار کیا حضرت فاطمہ بولیں کہ
حضرت اچھی چیز سب مانگتے ہیں میں بھی اچھی ہی چیز مانگتی ہوں حضور نے فرمایا سوتے وقت
سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔ لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ اکبر تینتیس ۳۳ تینتیس ۳۳ بار پڑھ لیا
کرو۔ بس اسپر راضی ہو گئیں۔ بھلا اب جو کسی عورت کو راضی کرو کہ سونیکے کڑوں کا کیا کرو گی
یہ تسبیح پڑھ لیا کرو۔ بیوی صاحب یہی کہیں گی کہ واہ جی واہ میں تو سونیکے کڑے ہی لونگی۔

بھلا انکو تو راضی کر لو۔ اللہ اکبر کیسی صاحبزادی تھیں اس بنا پر میں تو یہی کہتا ہوں عموماً توں ہے کہ چکی پیسو اور شان کو چھوڑ دو۔ کہاں کی شان۔ یہ ہے جواب مگر اخیر درجہ میں ایک اور جواب بھی عرض کرتا ہوں جسمیں شان بھی نہ جائیگی اور آمدنی بھی نہ گھٹے گی۔ وہ یہ ہے کہ بھائی جو کچھ کما رہے ہو کماؤ اور جس حالت میں ہو اُسی میں رہو۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ گناہ کی اجازت دیتا ہوں بلکہ میں توبۂ صادقہ کو چند سے ملتوی کرتا ہوں تاکہ اگر کامل اصلاح نہ ہو اور نہ بھی تو گو دور گو تو نہ رہے۔ کچھ تو تغیر کرو۔ اگر دوا نہیں پیتے پرہیز ہی کر لو۔ اگر پرہیز بھی نہیں ہوتا تو دستوں کی دوا ہی کھا لیا کرو۔ اور اگر اس کے کھانے سے بھی گریز ہے تو پھر اپنی ایسی تیسی میں جاؤ بھائی اگر مریض ہو کم ہمت تو اُسکی اتنی رعایت تو خیر طبیب مشفق کر سکتا ہے کہ دوا کے استعمال کو کچھ دن کے لئے ملتوی کر دے۔ اور فی الحال کوئی ایسی ہی تدبیر بتا دے جس سے مرض نہ بڑھے لیکن اُس تدبیر کے استعمال میں کچھ تو تغیر اپنی موجودہ حالت میں کرنا ہی پڑے گا۔ لہٰذا فی الحال میں بھی ایک ایسی بات عرض کرتا ہوں کہ جس سے نہ آپ کی تجارت کا کچھ نقصان ہو نہ آپ کی آمدنی کچھ گھٹے نہ آپ کی شان و شوکت میں کچھ فرق آوے اور گو اُس سے صحت نہ ہوگی مگر مرض بھی نہ بڑھیگا۔ پھر انشاء اللہ کسی نہ کسی وقت آپکا کام بھی بن جاویگا اور صحت بھی ہو جاویگی۔ انشاء اللہ میں ایک ایسا نمک دست آور بتائے دیتا ہوں کہ جس میں دنیا کا حرج تو مطلق نہیں اور دین کا نفع انشاء اللہ یقینی گو کامل نہ سہی مگر عدم سے وجود غنیمت ہے وہ نمک یہ ہے کہ دن بھر تو گو کھاتے رہو جیسا کھا رہے ہو لیکن سوتے وقت یہ کرو کہ مسجد میں نہیں بلکہ لیٹنے کی جگہ جہاں خلوت ہو بلکہ چراغ بھی گل کر دو تاکہ کوئی دیکھے نہیں اور کر کری ہو دو رکعت نفل نماز توبہ کی نیت سے پڑھکر یہ دعا مانگو کہ اے اللہ میں آپکا سخت نافرمان بندہ ہوں میں فرمانبرداری کا ارادہ کرتا ہوں مگر میرے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور آپ کے ارادہ سے سب کچھ ہو سکتا ہی میں چاہتا کہ میری اصلاح ہو مگر ہمت نہیں ہوتی۔ آپ کے ہی اختیار میں ہے میری اصلاح اے اللہ میں سخت نالائق ہوں سخت خبیث ہوں سخت گنہگار ہوں میں تو عاجز ہو رہا ہوں آپ ہی میری مدد فرمایئے میرا قلب ضعیف ہے۔ گناہوں سے بچنے کی قوت نہیں آپ ہی قوت دیجئے میرے پاس کوئی سامان نجات نہیں۔ آپ ہی غیب سے میری نجات کا سامان پیدا کر دیجئے۔

ایک دس بارہ منٹ تک خوب استغفار کرو اور یہ بھی کہو کہ اے اللہ جو گناہ میں نے ابتک
کئے ہوں اُنہیں تو اپنی رحمت سے معاف فرما دے۔ گو میں یہ نہیں کہتا کہ آئندہ اُن گناہوں کو
نکرونگا میں جانتا ہوں کہ آئندہ پھر کرونگا لیکن پھر معاف کرالونگا۔ غرض اسطرح سے روزانہ اپنے
گناہوں کی معافی اور عجز کا اقرار اور اپنی اصلاح کی دعا اور اپنی نالائقی کو خوب اپنی زبان سے
کہہ لیا کرو کہ میں ایسا نالائق ہوں میں ایسا خبیث ہوں میں ایسا بُرا ہوں غرض خوب بُرا بھلا
اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے سامنے کہا کرو۔ صرف دس منٹ روزانہ یہ کام کر لیا کرو۔ لو بھائی
دوا بھی مت پیو بدپرہیزی بھی مت چھوڑو صرف اس تھوڑے سے نمک کا استعمال سوتے وقت
کر لیا کرو حضرت آپ دیکھیں گے کہ کچھ دن بعد غیب سے ایسا سامان ہوگا کہ ہمت بھی قوی ہو جائیگی
شان میں بھی بٹہ نہ لگے دشواریاں بھی پیش نہ آئیگی۔ غرض غیب سے ایسا سامان ہو جائیگا کہ آج آپکو ذہن میں بھی
نہیں ہے۔ اچھا اب بھی کوئی مشکل طریقہ اصلاح کا ہے اس طریقہ پر کسکا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اسپر عمل کرنیکے بعد کوئی جھلا
کہ اسمیں خرابی ہے یہ دشواری ہے میں تب جانوں غرض کچھ تو کرو اسپر تو صبر نہیں ہوتا کہ اسلام کے سامنے نہ
فانی ہیں نہ آرزو ہے فنا کی۔ بھائی اگر فنا نہیں ہوس تو ہو فنا کی۔ یہ ہوس بھی انشاء اللہ خالی
نہ جائیگی۔ حضرت اور کچھ نہیں اتنا تو فائدہ ضرور ہوگا اگر روز کے روز معافی نہ چاہتے رہے تو جرائم
بڑھتے چلے جائیں گے اور سزا قوی ہوتی چلی جائیگی اور اگر روز کے روز معافی چاہتے رہے تو
گناہوں کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہوتا رہے گا پھر جتنا رہ جائیگا وہ شاید مرتے وقت توبہ سے جاتا رہے
ایک عزیز خدا نکرے دس جرموں کا مجرم ہو اور پیروی کرنے سے وہ ۹ جرموں سے تو بری ہو سکتا ہے
گو ایک میں پھنس جانیکا خوف غالب ہو تو کیا کوئی عاقل یہ کہے گا کہ جب سزا ہی سے نہ بچا تو پھر
ضرورت ہی کیا ہے پیروی کی۔ یا جتنی تخفیف سزا میں ہوسکے گی اسی کو غنیمت سمجھے گا اسیطرح
اے صاحب جو تدبیر تعزیرات الٰہیہ سے بچنے کی آسانی کے ساتھ ہو سکے اسکو تو اختیار کیجئے
اگر رہائی کی تدبیر نہیں کر سکتے تخفیف کی تو تدبیر آسان ہے اسی کو کیجئے خلاصہ مطلب یہ ہے
میرا کہ اگر حق تعالیٰ سے اطاعت کا تعلق نہیں ہے تو معذرت ہی کا تعلق سہی۔ کچھ تو
تعلق ہو۔ ایسی بھی غفلت کیا کہ فکر ہی نہیں کرتے سوچتے ہی نہیں کروٹ ہی نہیں لیتے۔
صاحب یہ حالت تو ہم سے نہیں دیکھی جاتی۔ اسے تو بدلو۔ کچھ تو تغیر اپنی حالت میں کرو

خلاصہ دستور العمل کا یہ ہے کہ جو کام جی میں آوے اول سوچو- فوراً مت کرلیا کرو- بلکہ سوچا کرو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز- اگر جائز ہو کرو- اگر ناجائز ہو اول چھوڑنیکا قصد کرو- اگر نفس کہے کہ اس کے چھوڑنے میں تکلیف ہے تو دیکھو کہ وہ تکلیف قابلِ برداشت ہے یا نہیں اگر قابل برداشت ہے سہہ لو اگر نہیں ہے تو خیر جہاں مبتلا ہو رہے ہو وہاں اتنا تو کرو کہ رات کو استغفار اور دعا نجات کی کرو- یہ ہوا خلاصہ دستور العمل کا اور یہ ہے اسلام کا پہلا سبق- اس سے عمل کی توفیق ہوگی- پھر عمل کی برکت سے علوم حاصل ہوں گے پھر ان علوم سے اسلام کی تکمیل ہو جائیگی اور جب خلاصہ تقریر کا یہ ہوا کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز تو اب ضرورت ہوگی تلاش احکام کی- پھر اسکی آسان صورت یہ ہے کہ ہر روز کچھ مسئلے جاننے والوں سے پوچھتے رہا کرو اسی طرح دروازے کھٹکتے کھٹکتے کھلنے شروع ہو جائیں گے- اسطور سے تھوڑے دنوں میں بہت دور نکل جاؤ گے اور خبر بھی نہ ہوگی- بھلو گے بھی نہیں یہ جو مضمون میں نے بیان کیا ہے ظاہر میں معمولی سا ہے لیکن میں اسی پہ فخر کرتا ہوں کہ ایسا مضمون قلب میں آیا جو کام کا سنوارنیوالا ہے گو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی جگہ میں نے تنگی اور دشواری نہیں پیش آنے دی تو صاحبو اسلام کا سبق تو شروع کرو- پھر انشاء اللہ ترقی ہوتے ہوتے اسلام حقیقی نصیب ہو جائیگا- پھر دیکھو گے کہ دنیا ہی میں اس حدیث کے معنی سمجھ میں آجاویں گے اور اس حدیث میں- جو جنت کی کیفیت مذکور ہے وہ دنیا ہی میں نظر آجائیگی حدیث یہ ہے

اعددت لعبادی الصالحین بالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

یہ حدیث قدسی ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں کہ جو نہ کسی کی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کے کان نے سنیں نہ کسی کے دل پر کبھی گذریں- صاحبو میں کہتا ہوں دنیا ہی میں آپ کو اسکا نمونہ نظر آجائیگا- جب آپ یہ وتیرہ اختیار کرلیں گے تو اسکے چند ہی روز بعد کیفیت پیدا ہوگی کہ آپ دیکھکر حیرت کرینگے کہ یہ تو کبھی ہمارے ذہن میں بھی نہ آئی تھی کبھی دیکھا سنا بھی نہ تھا- واللہ وہ وہ باطنی نعمتیں حاصل ہونگی کہ ہر وقت اطمینان اور راحت اور بشاشت اور سلطنتِ باطنی میں زندگی بسر ہونے لگے گی- اسوقت آپ کہیں گے کہ بادشاہونکی بھی زندگی اس زندگی کے سامنے ہیچ ہے- اسوقت نہ کوئی تکلیف تکلیف معلوم ہوگی نہ کوئی کلفت

کلفت یہانتک کہ موت جو سب میں ڈراونی چیز ہے یہ بھی محبوب معلوم ہونے لگے گی جیسا کہ اُن کو معلوم ہوئی جنکے منہ سے یہ نکلا ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم — راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

موت کی تمنا کرتے ہیں کہ کیا ہی خوشی کا دن وہ ہوگا کہ اس منزلِ ویراں یعنی دنیا سے محبوب حقیقی کی طرف روانہ ہوں گے۔ اُسوقت اگر کوئی کلفت یا بیماری بھی پیش آویگی تو وہ ایسی معلوم ہوگی جیسے آپ کسی محبوب پر عاشق ہوگئے ہوں اور وہ آپ کو منہ بھی نہ لگاتا ہو اتفاق سے مدتوں بعد اُسکو رحم آگیا اور وہ خود ہی آیا آپ کو تلاش کرتا ہوا۔ آکر پیچھے سے دفعۃً بغل میں ایسے زور سے دبایا کہ آپ کی ہڈی پسلی بھی ٹوٹنے لگیں جب تک خبر نہیں تھی کہ کون ہے اُسوقت تک تو نہایت تکلیف محسوس ہو رہی تھی لیکن جب پیچھے مڑکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہ محبوب ہے جو کبھی مجھے منہ بھی نہ لگاتا تھا۔ آج یہ میری قسمت کہ خود آکر ہم بغل ہو رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھئے کیا اب بھی آپ کو وہ تکلیف محسوس ہوگی جو پہلے ہو رہی تھی کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی تھیں۔ وہ محبوب قوی ہے تم ضعیف ہو اُسکے زور سے دبانے سے یہ تو ضرور ہے کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی ہیں مگر ذرا دل میں سوچکر دیکھو کہ وہ تکلیف کیا اب بھی تکلیف ہے یا راحت ہے۔ بدن کو تو بیشک تکلیف ہے لیکن دلکو وہ راحت پہونچ رہی ہے کہ روئیں روئیں ہیں گویا جان آرہی ہے۔ اب وہ محبوب کہتا ہے کہ اگر تمھیں میرے دبانے سے تکلیف ہو رہی ہو تو میں تمکو چھوڑکر تمھارے اس رقیب کو اسی طرح دبانے لگ جاؤں۔ کیونکہ یہ رقیب بھی اس تمنا میں ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھے بغل میں لیلو۔ اُسوقت یہ عاشق کیا کہے گا۔ وہی کہے گا جو حضرت عراقی کہتے ہیں ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت — سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ کہے گا اُسوقت ؎

ناخوشی تو خوش بود بر جانِ من — دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

اے میری جان تم کہتے ہو تکلیف میں کہتا ہوں تمھاری تکلیف بھی مجھے راحت ہے ؎

ناخوشی تو خوش بود بر جانِ من — دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

کیونکہ عاشق کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو
زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو

پھر تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تکلیفیں تو اب تکلیف نظر آرہی ہیں پھر وہ تکلیفیں بھی راحت ہو جائینگی۔ اسوقت وہ درجہ حاصل ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ درجہ ابھی حاصل نہیں ہے اسلئے سہل کر دیا ہے میں نے رستہ کو۔ ایسی بات بتائی ہے جسمیں تکلیف ہی نہو جسمیں سہولت ہی سہولت ہو۔ یعنی دن بھر گناہ ہونے کے بعد رات کو حق تعالیٰ سے دعا اور استغفار کر لیا کرو جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ مگر ایک چیز کی اور ضرورت ہوگی وہ یہ ہے کہ میں نے ابتک تخم پاشی یعنی بیج ڈالنے کی ترکیب بتائی ہے۔ میں نے ایک چھوٹا سا بیج ایسا بتایا ہے جسکی کاشت بہت آسان ہے لیکن جیسا کہ تخم پاشی کے بعد آب پاشی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اگر پانی ندو وہ بیج پھوٹتا اور بڑھتا نہیں۔ اسی طرح اسمیں بھی ایک چیز کی اور ضرورت ہے اور وہ بھی آسان ہے یعنی اللہ والوں کی صحبت خدا کے ان مقبول بندوں کی صحبت جنکو یہ درجہ نصیب ہو چکا ہے یہ آب پاشی ہے اسی تخم پاشی کے بعد مگر اسمیں جانچ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہر شخص کو دیکھکر عاشق نہ ہو جانا یعنی لوگوں کی عجیب حالت ہے کہ ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مذاق بگڑا ہوا ہے آج کل بہت سے سالج پھرتے ہیں اور لوگوں کو پھانستے پھرتے ہیں۔ اور لوگوں کی بھی یہ حالت ہے ؎

لختے برد از دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں ایسا ہرگز نہ چاہیئے۔ ہر شخص اللہ والا نہیں ہے بلکہ اسکی کچھ پہچان بھی ہے اسکا مختصر بیان یہ ہے کہ سب سے اول دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ شریعت کا بھی پابند ہے دوسرے یہ کہ دنیا کا لالچ تو اسمیں نہیں۔ یہ پہچانیں میں اسلئے بتلائے دیتا ہوں کہ دھوکہ میں نہ آویں رہزن کو رہبر نہ سمجھ لیں تیسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اسکی صحبت میں بیٹھکے دنیا کی محبت کتنی گھٹی حق تعالیٰ کی محبت کتنی بڑھی چوتھی بات یہ ہے کہ اسکے پاس رہنے والوں میں سے اکثر کی حالت باعتبار ترک معاصی وتقویٰ واہتمام اور حرام سے کیسی ہے پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو روک ٹوک بھی

کرتا ہو چھٹی علامت یہ کہ ضرورت کے موافق علم دین رکھتا ہو اور علماء سے محبت رکھتا ہو ساتویں علامت یہ کہ اہل علم و صلاح بہ نسبت عوام کے اسکی طرف زیادہ مائل ہوں اگر یہ علامتیں موجود ہیں تب تو وہ صحبت کے قابل ہے ورنہ ۵

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　پس بہ ہر دستے نباید داد دست

اور اس زمانہ میں بالخصوص اس شخص کے ظاہری اعمال کے صالح ہونے پر نظر کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے بعض بدعقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ بس صاحب اہل باطن ہونا چاہیے نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے صرف خدا کی یاد اپنے قلب کے اندر ہونیکی ضرورت ہے۔ اس دھوکہ میں ہرگز نہ آنا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۵

گر انارے میخری خنداں بخر　　　تا دہد خندہ اش زدانہ او خبر

آہ کیا عمدہ طریقہ تعلیم فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہو وہ تو بڑے عارف ہیں کہتے ہیں کہ انار خرید و تو بند محض نہ خرید و بلکہ کھلا ہوا خرید و ۵

نا مبارک خندۂ آں لالہ بود　　　کہ زخندہ او سواد دل نمود

یعنی ایک خندہ تو ہے انار کا جس سے اسکا نفیس ہونا معلوم ہوتا ہے اسی طرح اعمال ظاہری کے صالح ہونے سے معلوم ہوتا ہے ہاں یہ صاحب باطن ہے کیونکہ اعمال صالحہ کا صدور اعتدال واستقامت کی ساتھ بدون صلاح منشا یعنی باطن کے نہیں ہو سکتا اور ایک خندہ ہی لالہ کا اوپر ہی سے اندر کی سیاہی نظر آتی ہے اسی طرح اعمال فاسدہ سے باطن کی سیاہی پر استدلال ہوتا ہے غرض خود اسکے اعمال بھی درست ہوں اور اسکی صحبت میں بھی یہ اثر ہو کہ دوسروں کے اعمال بھی درست ہو جائیں۔ اس شخص کی صحبت اکسیر اعظم ہے اور یہ جو میں نے اہل اللہ کی صحبت کو بانی سے تشبیہ دی ہے اسمیں ایک اور بھی علمی فائدہ ہے وہ یہ کہ بعض لوگ فقط صحبت پر اکتفا کرتے ہیں خود عمل کچھ نہیں کرتے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے کھیت کے اندر سمندر کا سمندر کھینچ اور سارا دریا بہا لائے لیکن بیج نہ ڈالے تو اسمیں کونسی چیز نکلے گی سمندر کے اندر بیج تھوڑا ہی موجود ہے مطلب یہ کہ بیج تو ہو عمل اور پانی ہو صحبت اسوقت یہ حالت ہوگی جسکو حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فتصبح الارض مخضرۃ الآیہ اور آپ دیکھیں گے کہ انشاء اللہ

اس چھوٹے سے بیج سے وہ درخت نکلے گا کہ سارے عالم پر چھا جائیگا۔ پھر اس صحبت کے دو درجے ہیں اگر اہل حق کی صحبت جسے بھی میسر ہو یہ تو بڑی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اُسی کو فرماتے ہیں مولانا

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت ست
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت ست
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

اور اسی طرح اہل حق کی صحبت کے مقابلہ میں اہلِ باطل کی صحبت کی یہ حالت ہے

تا توانی دُور شو از یارِ بد
یارِ بد بدتر بود از مارِ بد

یعنی یار بد سانپ سے بھی بدتر ہے۔ کیوں

مارِ بد تنہا ہمیں بر جان زند
یارِ بد بر جان و بر ایمان زند

اور اگر اہل حق کی صحبت میسر نہ ہو کیونکہ ہر شہر میں ایسے لوگ موجود نہیں ہوتے تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ اُن سے خط و کتابت رکھو مگر خالی یہی نہیں کہ نوٹ بھیجو یا روپیہ بھیجو یا خیریت منگاؤ یا بیٹے کے واسطے یا بیوی کے واسطے تعویذ گنڈے منگاؤ وغیرہ یہ بھی سہی کبھی کبھی اگر دوسرے کام سے فرصت ہو لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ جب لکھو اپنی بیماریاں لکھو اور اپنے معمولات لکھو کہ مجھ میں یہ عیب ہیں میں یہ کر رہا ہوں اب آئندہ میں کیا کروں جیسے اگر طبیب کے پاس ہوتے تو سبحان اللہ اور اگر دور ہو تو خط میں جو حال ہو وہ لکھو اور جو نسخہ وہ تجویز کر کے بھیجے اُسے برتو۔ برتنے کے بعد پھر حال لکھو غرض دو چیزوں کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھو اطلاع اور اتباع یعنی احوال کی اطلاع اور اوامر کا اتباع۔ اسی طرح اتباع کے بعد پھر اطلاع پھر اس اطلاع کے بعد اتباع پھر اطلاع پھر اتباع غرض

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے جب بیماری ساری عمر کی ہے تو علاج ساری عمر کا کیوں نہ ہوگا۔ گو مہینہ میں ہی سہی حتی کہ دو مہینہ ہی میں ایک خط لکھو مگر لکھو ضرور اور یہ لکھتے ہوئے شرماؤ نہیں کہ وظیفہ جو بتایا تھا وہ چھوٹ گیا تھا یا مطالعہ کتب جو تجویز کیا تھا اُسے نباہا نہیں یہانتک کہ فرض نماز بھی فرض کرو قضا ہونے لگی ہو تب بھی شرماؤ نہیں بلکہ اب پھر پڑھنا شروع کر دو اور اطلاع کرو شرمانا اس رستہ میں ہرگز نہیں چاہیئے۔ خواہ کیسی ہی گندی حالت کیوں نہ ہو جائے اُسکی بھی اطلاع کر دو۔ ایک دریا تھا اُسکے کنارے کے پاس سے ایک ناپاک آدمی گذرا دریا نے اُس سے کہا کہ آ میں تجھے پاک کر دوں۔ اُس نے کہا کہ تو صاف و شفاف اور میں پلید و ناپاک میرا منہ کیا کہ میں تیرے پاس آؤں پاک ہو کر آؤنگا۔ دریا نے کہا بچہ جی پاک کرونگا بھی میں ہی اگر تم مجھسے

شرما گئے تو ساری عمر ناپاک ہی رہو گے بس ایک دفعہ بیحیا ہو کر آنکھیں بند کرکے میرے اندر کود پڑو
مجھ میں سے ایک موج اٹھیگی اور تمہارے سر پر کو ہو کر اتر جائیگی اور تمھیں دم میں پاک صاف کر دیگی۔
آہ اہل اللہ سے اپنا کچا چٹھا کہہ دو۔ بہت سے لوگ اسلئے نہیں کہتے کہ ہماری شان گھٹ جاویگی ارے انکے نزدیک
تیری شان ہی کیا ہے جو گھٹ جاویگی بعضے ڈرتے ہیں کہ خفا ہونگے ارے انکی خفگی بھی رحمت ہے یہ ساری تکبر کی
باتیں ہیں ارے وہ پھانسی بھی دیدینگے تو اسمیں بھی تیری بہتری ہی ہوگی اسواسطے کہ ؎

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ — شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ ؎
آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست — نائب ست و دست او دست خداست

؎ ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ ۔ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ + تو اس سے بڑھکر کیا ہوگا غرض خفگی وغیرہ کا
بالکل خیال نکرو بس اسطرح اس سے تعلق رکھو کہ اگر اسکی طرف سے خفگی ہو نکالدے پھر بھی تعلق قطع نکرو۔ وہ نکالدے
تو تم مت نکلو اسوقت تو نکل جاؤ مگر پھر آجاؤ پھر نکالدے پھر نکل جاؤ پھر آجاؤ۔ پھر نکل جاؤ پھر آجاؤ غرض اوسے
چھوڑو مت وہ قصائی نہیں ہے، وہ اگر سختی بھی کرتا ہے تو محض تمہاری مصلحت سے کیونکہ ؎ درشتی و نرمی
بہم در بہ است ۔ چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است + سیر کی روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کو خطاب ہوا کہ اے موسیٰ میرے ساتھ اسطرح رہو جس طرح بچہ ماں کی ساتھ رہتا ہے انھوں نے تفسیر پوچھی
ارشاد ہوا کہ بچہ کو ماں مارتی ہے مگر وہ بچہ پھر اسی سے چمٹتا ہے مگر یہ علاقہ صرف اس سے رکھو جو واقعی اہل اللہ
ہو لیکن چونکہ یہاں سے ہر روز تو خط جاتا نہیں اور وہاں سے ہر روز تو خط آتا نہیں۔ پھر اس درمیان میں
کیا کرو یہ کرو کہ حکایات اور ملفوظات اہل تقویٰ کے مطالعہ میں رکھو بس خلاصہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہو
اگر صحبت میسر نہو سکے تو خط و کتابت کیساتھ مطالعہ کتب کا بہت غور سے کرو یہ اسکا بدل ہے ؎
چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب ۔ بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب ۔ ؎ چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ ×
چارہ نبود در مقامش جز چراغ + اسی طرح اگر انکی مفارقت دنیا سے ہو جائے یا ہم سے ہو جائے یوں ہی کرنا چاہئے
؎ چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ + چارہ نبود در مقامش جز چراغ + یعنی اگر آفتاب نہو تو میاں چراغ
ہی جلالو کیونکہ ہر جگہ تو آفتاب ہر وقت نہیں رہ سکتا تو خیر اسکا بدل سہی یہ نکرو کہ کھاؤنگا گھی سے نہیں جاؤنگا
جی سے مطالعہ کتب کی نسبت فرماتے ہیں ؎ درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است + صراحی مے ناب و سفینۂ غزل است
نیز اگر شیخ کی صحبت میسر نہو تو پیر بھائی بھی غنیمت ہے اور اس تعلق کیلئے یہ ضرور نہیں کہ مرید ہی ہو جاؤ۔ بس اپنے کو

میسر ذکر دو۔ کیوں غلام بنے کسی کے صحبتِ اہل اللہ اور انکے بجائے انکے ملفوظات کے متعلق عارف شیرازی کی رائے مجھکو بہت ہی پسند آئی فرماتے ہیں ؎ مقامِ امن و مئے بے غش و رفیقِ شفیق ٭ گرت مدام میسر شود زہے توفیق ٭ یعنی اطمینان کی جگہ اور ذکر و شغل اور کسی محقق اور شفیق شیخ کی صحبت ہمیشہ میسر رہے تو کیا بات ہے اگر یہ نہو تو پھر ؎ دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست ٭ صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل ست ٭ صراحیِ مئے ناب ذکر اللہ ہے اور سفینۂ غزل ہو یہ ملفوظات ہیں بزرگوں کے۔ حضرات میں نے یہ ایک دستور العمل مختصر سا تجویز کر دیا ہے جو کسی پر بھی دشوار نہیں اور اگر اسپر بھی عمل نہ کیا تو پھر میں یہ کہونگا ع جو اسپر بھی وہ نہ سمجھے تو اُس بُت کو خدا سمجھے ٭ خوب سمجھ لیجئے حجت اللہ ختم ہو چکی ہے اب آپکے پاس کوئی عذر نہیں رہا ہے خدا کے سامنے یہانتک تو آپکو رخصت دیدیگئی کہ اگر عمل کی طرف توجہ نہیں ہے تو اس بے توجہی عمل کا اقرار اور توجہ پیدا ہونیکی دعا تو کر لیا کرو۔ یہ اخیر بات ہے اب اس سے آگے اور کیا چاہتے ہو۔ غرض یہ ہے اسلام کی تفسیر اور اسکی تکمیل کی تیسیر۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمت قویہ اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ (پھر ہاتھ اٹھا کر اس طرح دعا شروع کی اللھم وفقنا لما تحب و ترضیٰ۔ پھر آہستہ آہستہ دعا مانگتے رہے۔ بعد ختم دعا احقر سے فرمایا ۱۲ کاتب) اس بیان کا نام ملت ابراہیم مناسب ہے کیونکہ مولوی صاحب (یعنی خطیب جامع مسجد مولوی محمد ابراہیم صاحب ندیری محرک سفر و وعظ ۱۲ کاتب) کا یہی نام ہے (اسکے بعد اعلان کیا گیا کہ اتوار کے دن آٹھ بجے دن کو مدرسہ میں وعظ ہوگا)

مختصر کیفیت وعظ الحمد للہ رنگون کا یہ پہلا وعظ جو نہایت زور و شور کیساتھ ڈھائی گھنٹہ تک ہوتا رہا ختم ہوا۔ بفضلہ بہت زیادہ مجمع تھا جسکا تخمینہ زائد از دو ہزار کیا گیا۔ سب لوگ نہایت متاثر تھے۔ اور نہایت سکوت کیساتھ سنتے رہے۔ بعد وعظ بجید اشتیاق کے ساتھ لوگوں نے مصافحہ کیا۔ ایک دوسرے پر گرتا تھا۔ بڑی مشکل سے وار آتا تھا حضرت نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دئے تھے اور لوگ بھی کہ مشتاقانہ بڑھ بڑھ کر چوم رہے تھے اور پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے ایسے موقعہ پر حضرت پر ایک عجیب حالت انکسار اور تواضع کی طاری ہو جاتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت دوران مصافحہ میں ہر شخص کی طرف نظر توجہ بھی ڈالتے جاتے ہیں جیسا کہ دیکھنے والے پر مخفی نہیں رہتا۔ غرض عجیب دلفریب منظر ہوتا ہے اور اسوقت حضرت پر ایک عجیب شان محبوبیت برستی ہے

العبادة

این	متی	کم	کیف	من ای شان	لم	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	ہیئت بیان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سبب وعظ	کیا مضمون تھا	کسنے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
بمکان حکیم عبدالرحمن صاحب ترپ بازار حیدرآباد دکن	۲۵ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۱ھ پنجشنبہ بعد ظہر	۱½ گھنٹہ	کرسی پر بیٹھکر				محمد عبدالحلیم	۱۰۰	مجمع رجال و نساء

دعا خطبہ ماثورہ۔ تعوذ و تسمیہ۔ رب السموات والارض وما بینہما فاعبدہ واصطبر لعبادتہ ط ہل تعلم لہ سمیاً ۵ (وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سو تو اسکی عبادت کیا کر۔ اور اسکی عبادت پر قائم رہ بھلا تو کسی کو اسکا ہم صفت جانتا ہے) چونکہ وقت مختصر ہے لہذا مختصر مضمون اختیار کیا گیا ہے لیکن اختصار پر بھی وہ کافی وافی ہے کیونکہ وہ اصل ہے تمام ضروری مضامین کی۔ اور اصل اس وجہ سے ہے کہ اسکا ذہن میں راسخ کر لینا تمام عمر کی رہبری کیلئے کافی ہے۔ اور ہر چند کہ وہ مضمون تمام فروع اور جزئیات کے احاطہ کیلئے کافی نہیں مگر فروع کے تجسس و تفحص اور تحقیق کیلئے کافی ہے یعنی اس اصل کے نہ جاننے سے ہم جیسی اب غفلت کر رہے ہیں کہ یہ جانتے ہی نہیں کہ ہم کچھ کوتاہی بھی کر رہے ہیں۔ اس اصل کے جان لینے کے بعد فکر تو پیدا ہو جائیگی کہ ہم میں کسی چیز کی کمی ہے۔ پھر اس کوتاہی کی اصلاح اس اصل کے مستحکم کر لینے سے ہو جائیگی۔ اور اسی سے اس مضمون کی اہمیت بھی معلوم ہو جائیگی۔ لہذا اسکے اختصار پر نظر نہ کیجائے بلکہ بیداری اور توجہ کے ساتھ سننا چاہیئے۔ نیز ہمارے اندر ایک کمی تو غفلت اور جہل کی ہے اور ایک کمی یہ ہے کہ اگر علم بھی ہو جاتا ہے تو وہ علم درجہ قال ہی تک محدود رہتا ہے حال نہیں بنتا یعنی عمل کی توفیق نہیں ہوتی حاصل یہ ہے کہ اگر کبھی اپنی کوتاہی اور غفلت کا علم بھی ہو جاتا ہے تو وہ تنبہ درجہ قال ہی تک

تمہید و ضرورت بیان

تحقیق قال و حال بمثال

رہتا ہے کیونکہ قال سے صرف زبان ہی سے کہنا مراد نہیں تاکہ علم کے قال ہونے پر اشکال ہو بلکہ قال دونوں کو عام ہے قال باللسان کو بھی اور قال بالجنان کو بھی جیسے کلام کی دو قسمیں ہیں لفظی اور نفسی بلکہ اصل تو قال بالجنان ہی ہے جیسے کلام نفسی اصل ہے اور کلام لفظی محض دلیل ہے کلام نفسی پر جیسا کہا گیا ہے ؎

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

اور اسی قال کو ہم تصور کے لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اب خواہ آپ تصور کہئے یا قال بالفواد کہئے بس ہمارا علم اس درجہ سے آگے نہیں بڑھتا یعنی حال نہیں ہو جاتا۔ اسکی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص پر قتل کا مقدمہ ہو اور اسکا علم اسکے پڑوسی کو بھی ہے مگر صاحب معاملہ اور پڑوسی کے علم میں بہت فرق ہے۔ صاحب مقدمہ کا تو وہ حال ہو جاتا ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں ہر وقت اسی کے تدبر و اہتمام میں لگا رہتا ہے کہیں گواہوں کی تلاش ہے کہیں پیروی کے واسطے اچھے وکیل کی جستجو اور کہیں بیان تحریری وغیرہ کی فکر اور کہیں وسائل و سفارش کی کوشش غرض وہ ہر وقت اسی کی دھن میں لگا رہتا ہے وہ کھاتا ہے مگر اسکا کھانا نہ کھانے سے بدتر وہ سوتا ہی مگر سونا جاگنے سے بدتر۔ بہرحال اپنے تمام ضروریات و حوائج بھی پورے کرتا ہے مگر دھن اور فکر کسی اور ہی چیز کی ہے۔ اور ایک اسکا پڑوسی ہے کہ اسے بھی اس معاملہ کی اطلاع ہے پھر ایک تو وہ پڑوسی ہے جسے اسکے ساتھ عناد ہے۔ وہ تو الٹا خوش ہوگا۔ اور ایک وہ پڑوسی ہے جسے اس سے ہمدردی ہے اور اسکو علم ہے کہ ایسا سنگین مقدمہ قائم ہے اور خوف عقلی بھی ہے کہ ایسا نہ ہو مقدمہ اسکے خلاف فیصل ہو مگر اسے بھی وہ دھن نہیں ہے سو یہ دو حالتیں ہیں ایک حالت قال ہے اور دوسری حال اس صاحب معاملہ کیلئے تو یہ مقدمہ حال بنگیا ہے اور پڑوسی کیلئے قال ہے اسی طرح ہماری حالت بھی دوسرے درجہ کی حالت ہے۔ پھر افسوس ہے کہ اپنا ہی معاملہ اور ایسی بیفکری۔ تو یہ بھی ایک فرد ہے غفلت کی کہ توجہ اس درجہ کی نہیں جس درجہ کی ضرورت ہے۔ غرض جسطرح عدم العلم ایک کوتاہی ہے اسی طرح عدم الالتفات یا عدم التوجہ بھی ایک کوتاہی ہے مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر دونوں کوتاہیاں ہیں کہ یا تو علم ہی نہیں یا علم ہے تو التفات نہیں اس اصل کے راسخ کرنے سے انکا بھی تدارک ہو جائیگا کیونکہ عبادت کی حقیقت علم و عمل کے جمع

ہمارے اندر دو کوتاہیاں ہیں عدم العلم یا عدم التوجہ

کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اسلئے اس مضمون کو بہت ہی ضروری سمجھا جاوے اور اسکے اختصار پر نظر نہ کیجاوے۔ آخر مباحث علمیہ میں بھی تو یہی بات ہے کہ مقدمات میں طول ہوتا ہے اور مقصود میں اختصار ہوتا ہے اسی طرح مقاصد معاشیہ میں بھی ہے چنانچہ کھانیکو لیجئے کہ اسکے مقدمات کتنے طویل ہیں زمین درست کرو ہل چلاؤ چھ مہینے تک پانی سے سینچو اور کھیت کی حفاظت کرو پھر غلہ کاٹو پھر اُسکا بھوسہ الگ کرو پھر پیسو پھر پکاؤ تب کھاؤ۔ مقصود کتنا مختصر ہے کہ ایک منٹ میں لقمہ بنا کے کھا جاؤ اور مقدمات کسقدر طویل ہیں جسمیں چھ مہینے صرف ہوتے ہیں۔ جیسے ایک پیر جی تھے تین تین سیر کھا جاتے اور چلتے تھے چالیس چالیس کوس دونوں کام میں کامل تھے وہ کہا کرتے تھے کھانا کون مشکل ہے منہ میں رکھا نگل لیا منہ میں رکھا نگل گیا اور چلنا کیا مشکل ہے پاؤں کو اٹھایا آگے رکھدیا پاؤں اٹھایا آگے رکھدیا۔ یہ کھانے کے اختصار پر یاد آگیا۔ دیکھئے کھانے کے مقدمات تو چھ مہینے میں ختم ہوتے ہیں اور خود مقصود کتنا مختصر ہے۔ آجکل یہ بھی ایک مرض ہے کہ تقریر کو اُسکے طول وعرض سے مہتم بالشان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مقصود اُسمیں بھی مختصر ہی ہوتا ہے بہر حال یہ مضمون بھی مختصر ہے اور اسکا مجمل عنوان ہے عبادت۔ اسے بھی سنکے ایک وسوسہ ہوا ہوگا کہ ارے یہ تو وہی پورانا مضمون ہے جسے رات دن سنتے رہتے ہیں۔ یہ بھی آجکل ایک مرض ہے کہ ہر چیز میں جدت کی تلاش ہے حتیٰ کہ مضمون بھی نیا ہی چاہتے ہیں حالانکہ مضمون کا نیا ہونا تو آفت ہے کیونکہ وہ اگر مستند الی الوحی ہو تو پورانا ہوگا اور اگر نہو تب نیا ہوگا تو جو مستند الی الوحی نہیں وہ تو بدعت ہوگا اور کل بدعۃ ضلالۃ کے تحت میں داخل ہو کر گمراہی پھیلانیوالا ہوگا۔ غرض جو مضمون مستند الی الوحی ہوگا وہ تو پورانا ہی ہوگا مگر میں اطمینان دلاتا ہوں کہ مضمون بھی نیا ہی ہوگا باعتبار عنوان وتدوین وتحقیق کے نہیں بلکہ نیا باعتبار عنوان وعلم کے ہوگا یعنی ہے تو پورانا مگر سامعین کو اب معلوم ہوگا اسلئے علم کے اعتبار سے نیا ہے۔ جیسے کوئی مریض جسے مختلف نسخہ استعمال کرنیکے بعد بھی شفا نہوئی ہو کسی طبیب کے پاس جاوے اور یہ درخواست کرے کہ حکیم صاحب کوئی نیا نسخہ لکھئے ان پورانے نسخوں سے تو شفا نہیں ہوتی اور حکیم جی اُسے نیا نسخہ کہکر لکھدیں۔ مگر وہ بھی پورانا ہی ہوگا کہ منقول تو قدما ہی سے ہے ہاں باعتبار حاصل ہونے کے مریض کو نیا معلوم ہوگا غرض جدت کی حیثیتیں مختلف ہیں سو اگر اس اعتبار سے کوئی جدت کا متمنی ہو تو بیجا نہیں۔ تو اس درجہ میں

فائدہ: مادی مقدمات میں طول ہوتا ہے اور مقاصد مختصر

فائدہ: مقصود بالذات عبادات ہیں

فائدہ: بعض جدت کی تعریف

یہ مضمون بھی نیا ہے۔ ایک رسم اور ہوگئی ہے کہ اصلاح کرنیوالوں کی حالت یہ ہے کہ نئے مضمونوں
میں بھی وہ مضامین انتخاب کرتے ہیں جسمیں ذرا گرمی ہو۔ حالانکہ وہ مضامین انتخاب کرنا چاہئے
جنکی ضرورت ہو۔ سو جو مضمون بیان ہوگا .... الحمد للہ وہ ضروری بھی ہے اور اسمیں
دونوں حیثیتیں بھی جمع ہوگئیں کہ حقیقت کے اعتبار سے قدیم اور عارض کے اعتبار سے جدید
غرض اسمیں جدت کی بھی حیثیت ہے اسلئے جدت پسندوں کے مذاق میں بھی توجہ کے لئے کافی
ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ مضمون کی طرح عنوان بھی تو پورانا ہی ہے یعنی عبادت۔ سو جواب یہ ہے
کہ عنوان گو پورانا ہی مگر جب اسکی حقیقت ہم نہیں سمجھتے تو اس اعتبار سے وہ جدید ہی ہے پھر
حقیقت نہ سمجھنے کی دو حالتیں ہیں ایک نہ سمجھنا اور ایک مستحضر نہ رکھنا کہ میں نے اوپر اسکو بھی نہ
سمجھنے سے تعبیر کردیا پھر اسکے بعد جو عملی کوتاہی ہوگی وہ تیسرے درجہ میں ہوگی۔ اسلئے اس مضمون میں
جو اول درجہ ہے یعنی عبادت کی حقیقت نہ سمجھنا وہ اول سمجھائی جائیگی کیونکہ حقیقت ہی سے
سبکو غفلت ہے ضرورت تو قریب قریب سب جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت بہت مشہور ہے۔
وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے
پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں) عبادت ایسی ضروری چیز ہے کہ غایت خلق جن و
انس کی بھی ہے اور یہاں جن کو بھی انسان کے ساتھ ذکر اشریک کیا گیا ہے اور دوسرے اکثر
مقامات میں باوجودیکہ جن بھی انسان کی طرح تمام احکام شرعیہ کے مکلف ہیں مگر پھر بھی تعبیر
میں جو جن کا ذکر نہیں آتا تو وہ اکتفاء ہے لہذا انسان ہی کا ذکر آتا ہے ورنہ احکام شرعیہ دونوں
ہی میں مشترک ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوگیا کہ آفرینش کی غایت محض عبادت ہی ہے
اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بجز اسکے اور کوئی مقصود ہی نہیں۔ تمام مقاصد کا انحصار کرکے
فرمایا کہ صرف عبادت کیا کریں اور اس حصر سے باوجودیکہ سب غایات کی نفی ہوگئی مگر پھر بھی
جن غایات کی مقصودیت کا باعتبار عادات کے کچھ شبہ ہوسکتا تھا اس مقام پر
ان سب کی نفی تصریحاً بھی فرمادی۔ کلام الٰہی میں ہمارے عادات و محاورات کی بہت رعایت
کیگئی ہے بعض غایات کو تو انسان بھی غایت نہیں سمجھتا اسکی نفی کی ضرورت نہ تھی جنکو
مقصود سمجھنے کا احتمال تھا صرف انہیں کی نفی کیگئی۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے ما ارید منہم

غایت خلق انسان کی تحقیق

من رزق وما ارید ان یطعمون ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین (میں اُن سے (دوسری مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا۔ اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھکو کھلایا کریں۔ اللہ خود ہی سبکو رزق پہنچانیوالا ہے قوت والا نہایت قوت والا ہے) سبحان اللہ کیسی بلاغت ہے کہ ع بریں طرز گر جان فشانم رواست یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اس حصر اور اس وعدہ پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی فی الدنیا اکثروں کا مذہب ہو گیا ہے۔ کفار و ملاحدہ تو دنیا پرست ہیں ہی اُن سے دنیا طلبی کچھ بھی بعید نہیں تعجب تو مسلمان پر ہے کہ باوجود اسلام کے پھر طالب دنیا کیوں ہے۔ میرا کسب دنیا پر اعتراض نہیں ہے اسکے لئے تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ دیکھئے کسب حلال کو فرض تک فرمایا لیکن طلب کے درجہ کی کسقدر صریح عنوان سے مذمت فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ حب الدنیا رأس کل خطیئۃ اب اسمیں یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ غیر محقق علماء تو مطلقاً دنیا چھوڑاتے ہیں۔ کہ دنیا کی ثروت اصلاً نہ حاصل کرو بلکہ ذلیل بنکے رہو۔ استغفر اللہ۔ یہ ہرگز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصود نہیں ہاں آپکا مقصود یہ ضرور ہے کہ فرعون بنکے نہ رہو اسلئے یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اسقدر ترقی دنیا کے درپے ہو کہ اُسی کو مقصود بالذات قرار دے تو یہ درجہ حب دنیا ہے خواہ جاہ کی طلب ہو یا مال کی اس درجہ میں انکی تحصیل و طلب بھی حب دنیا ہے اور اسکے یہ دونوں شعبے دین کو خراب کرنیوالے ہیں غرض حب الدنیا کو منع کیا گیا ہے کہ کسب الدنیا کو بلکہ اُسکو تو فرض قرار دیا گیا۔ اور اب تو کھلم کھلا حب الدنیا کی ترغیب و تعلیم دیجا رہی ہے۔ اور اگر کوئی اسپر بھی کہے کہ ہم تو حب الدنیا کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ کسب الدنیا کی ترغیب دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اسکا ایک معیار ہے وہ یہ کہ یہ دیکھ لیا جاوے کہ جب دین اور دنیا میں تزاحم ہوتا ہے تو کسکو ترجیح دیجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا ہی کو ترجیح دیجاتی ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ دنیا مقصود بالذات ہے اسپر حب دین کا دعوے سو اسکی۔ بالکل وہی حالت ہے کہ گھر بار تمہارا مگر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا۔ جو وقت دنیا کے کاموں سے بچگیا اُس میں کبھی نماز بھی پڑھ لو خواہ وقت تنگ ہی ہو گیا ہو بلکہ نکل ہی گیا ہو اور جماعت کا فوت ہونا تو کوئی بات ہی نہیں۔ تو یہ تحصیل دنیا بھی حب دنیا ہی خلاصہ یہ کہ اگر تزاحم کے وقت کسی نے دین کو ترجیح دی اور دنیا کی اسکے مقابلہ میں پرواہ نہیں کی تو

ف: باوجود طلب دنیا میں مصروف ... مسلمان بلا عذر ...

ف: کسب دنیا محمود ہے اور طلب دنیا مذموم

ف: کسب الدنیا اور حب الدنیا الخ یعنی میں فرق کیا ... بعض علماء کی غلطی

ف: حب دنیا و کسب دنیا کے امتیاز کا معیار

اسکی تحصیل دنیا یہ کسب الدنیا ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دی اور دین کو موخر رکھا تو یہ حب الدنیا ہے بہر حال یہ اجمالی تقریر بھی حب الدنیا اور کسب الدنیا کے فرق کیلئے کافی ہے۔ چونکہ ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اسطرح دنیا کو مقصود بنائے ہوئے ہے اسلیئے اسکا تدارک فرماتے ہیں۔ ما ارید منھم من رزق۔ ای لانفسھم ولا لعیالھم۔ وما ارید ان یطعمون۔ ای وما اردت بخلقھم ان یطعمونی۔ یعنی میں نے اسلیئے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کیلئے رزق ڈھونڈیں اور نہ اسلیئے پیدا کیا کہ وہ مجھے کھلادیں۔ یہاں ایک نکتہ سمجھنا چاہیئے کہ اطعام حق کے غایت ہونے کا تو احتمال ہی نہ تھا پھر اسکی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ سو نکتہ یہ ہے کہ یہاں دونوں میں دو غایتوں کی نفی کو قرین فرمایا اُن میں ایک ایسا امر ہے کہ اسکے غایت ہونے کا احتمال ہی نہیں اور ایک میں اسکا احتمال تھا سو دونوں کو قرین فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسا ایک امر یقیناً منفی ہے ایسا ہی دوسرے کو سمجھو کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے چنانچہ اس علت کو اسطرح ذکر فرمایا کہ ان اللہ ھو الرزاق الخ یعنی وہ تو خود بڑے رازق ہیں کہ تمکو اور تمھارے عیال کو سبکو رزق دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے وامر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا لانسئلک رزقاً نحن نرزقک یہ آیت بھی اس کے قریب ہے خلاصہ یہ کہ نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ اس مقصود کو ثابت فرمادیا کہ انسان کو حق جل وعلیٰ شانہ نے صرف عبادت کیواسطے پیدا کیا ہے تو عبادت اتنا بڑا امر اہم ہے۔ اب صرف یہ سمجھنا باقی رہا کہ عبادت ہے کیا چیز۔ سو اسمیں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ اسکی حقیقت کو نہیں سمجھا سو جو عربی جاننے والے ہیں انکو تو اسکی حقیقت سمجھنا آسان ہے مگر حق تعالیٰ کی تعلیم ایسی سہل ہے کہ اسکا فیض سبکو پہنچا ہے چنانچہ لفظ عبادت ہی کو محاورات میں ایسا جاری کردیا گیا کہ اب کوئی بھی اس سے ناواقف نہیں ہے مگر غایت ظہور کی وجہ سے اسکی حقیقت سمجھنے میں خفا ہوگیا۔ چنانچہ اسکا مفہوم سب کیلئے بہت ہی آسان ہے جو لوگ عربی داں ہیں وہ تو لغت میں دیکھ لیں گے کہ اسکے معنی ہیں غایۃ التذلل مگر عوام جو لغت نہیں جانتے اگر ان کے سامنے صرف اسی کو پیش کیا جائے تو انکو یہ شبہ ہوگا کہ یہ ابھی تراشا گیا ہے اسلیئے میں ان کے مستعمل محاورہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ

انسان کی غرض تخلیق محض عبادت ہی ہے۔ عبادت کا مفہوم اور

عبد کے معنی سبکو معلوم ہے کہ غلام ہیں چنانچہ عوام میں بھی عبداللہ عبدالرحمن نام اسی واسطے رکھے جاتے ہیں اور عبادت اسی عبد کا مصدر ہے اور عبد اسی مصدر سے مشتق ایک صفت ہے جب عبد کے معنی غلام ہیں تو عبادت کے معنی عبد شدن یعنی غلام ہوجانا یا بندہ ہوجانا ہوئے بندہ فارسی ہے اور عبد اور غلام عربی ہے مگر غلام کو اردو بھی کہہ سکتے ہیں اسلئے کہ اردو میں سب زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں اور غلام کا لفظ بہ نسبت عبد بلکہ بہ نسبت بندہ کے بھی بوجہ کثرت استعمال کے زیادہ اقرب الی الفہم ہے بہرحال ان تینوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس سے عبادت کی حقیقت مجملہ تو سمجھ میں آگئی کہ غلام ہونا ہے۔ اب تفصیل سمجھ لیجاوے اور اسکے لئے مقدمات علمیہ کی حاجت نہیں بلکہ میں روزمرہ کے معاملات سے واضح کردونگا۔ وہ یہ کہ جب غلام کی حقیقت واضح ہوگئی تو جو لوازم ہیں غلام کے انہیں بھی ابتداً اور لازم سمجھنا چاہیے یہانتک عنوان کی تعیین ہوگئی کہ وہ عبادت ہے جسمیں بحث کرونگا۔ اور اگرچہ اس مبحث کے لئے آیت (وما خلقت الجن الخ) زیادہ مناسب بھی کیونکہ مشہور بھی ہے اور عموم میں صریح بھی ہے مگر صرف جدت کے خیال سے میں نے دوسری آیت پڑھی کیونکہ جدت پسندی اسقدر بڑھگئی ہے کہ کثیر التلاوۃ نصوص سے بھی لوگوں کو وحشت ہونے لگی ہے۔ اسلئے آیتیں بھی نئی نئی تلاش کرنا پڑتی ہیں چنانچہ جو آیت میں نے شروع میں تلاوت کی ہے یہ سورۂ مریم کی ہے اور سورۂ مریم کون پڑھتا ہے۔ حافظ بھی تو رمضان ہی میں شوق کرتے ہیں روزمرہ کون قرآن پڑھتا ہے۔ چنانچہ ایک حافظ فخراً کہتے تھے کہ میں صرف رمضان ہی میں پڑھتا ہوں مگر یہ کہنا ایسا ہی ہوا جیسے کوئی کہے کہ فلاں میرا محبوب ہے مگر میں اسے سال بھر کے بعد دیکھتا ہوں۔ اور پہچان لیتا ہوں۔ اب تو اسپر فخر کرتے ہیں کہ سال بھر قرآن نہیں پڑھتا اور رمضان میں تراویح میں سنادیتے ہیں میں کہتا ہوں اگر محض حافظ ہوجانا کمال ہے تو بہت سے بھوت بھی حافظ ہوتے ہیں چنانچہ بہت سے واقعات سنے ہونگے کہ فلاں عورت پر جن آتا ہے اور وہ قرآن پڑھتا ہے۔ تو اصل کمال حافظ ہونا نہیں ہے بلکہ تعلق مع اللہ اور تعلق مع القرآن ہے اسی کی تکمیل و تسہیل کیلئے حافظ بنائے جاتے ہیں سو اگر ایسا تعلق ناظرہ خواں رکھے وہ ہزار درجہ افضل ہے ایسے حافظ سے بہرحال یہ آیت حافظ صاحب کے اعتبار سے بھی نئی ہے کیونکہ وہ اول تو سال بھر تک پڑھتے ہی کہاں ہیں اور جب پڑھتے بھی ہیں تو ابھر

التفات کب ہوتا ہے اور اگر التفات بھی ہو تو ترجمہ کے اعتبار سے تو ضرور ہی نئی ہے بہرحال حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ رب السموات والارض وما بینہما فاعبدہ واصطبر لعبادتہ هل تعلم له سميا۔ اصل محط فائدہ اور ماسیق لہ الکلام اس آیت میں فاعبدہ ہے اور اسکا سباق تمہید کیلئے ہے اور سیاق یعنی واصطبر لعبادتہ اُسکا متمم ہے اور هل تعلم له سميا اُسکی تائید ہے بہرحال سباق و سیاق تمہید و تائید کیلئے ہیں اور اصل مقصود فاعبدہ ہے۔ اور ابتدا اسکی جو رب السموات الخ سے کیگئی تو وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے کلام کی عادت ہے کہ جب کوئی مشکل کام بتاتے ہیں تو اُسکے آسان کرنے کا بھی اُس جگہ اہتمام فرماتے ہیں اور اہتمام میں نے مجازاً کہدیا ورنہ اہتمام مشتق ہے ہم بمعنی فکر سے اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہیں مطلب یہ ہے کہ کلام الٰہی میں بھی التزام ہے کہ سہولت کی بھی رعایت کیجاتی ہے اسکو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص تو اسکول کا ماسٹر ہے گو بچوں کو وہ تعلیم دیتا ہے مگر چونکہ پبلک کا نوکر ہے اسلئے اُسے کوئی خاص اُنس و شفقت نہیں بلکہ محض ضابطہ اور وقت کا پابند ہے۔ اسلئے اس سے بھی بحث نہیں کہ میں نے جو کچھ پڑھایا وہ بچوں کی سمجھ میں بھی آیا یا نہیں کیونکہ تنخواہ دار استاد کو بچوں سے بالکل اجنبیت ہوتی ہے محض اپنی تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے اور ایک تعلیم ہے باپ کی کہ وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میرا بیٹا سمجھ ہی جائے۔ ان دونوں کی تعلیم میں بڑا فرق ہے۔ ماسٹر تو اپنے گھنٹہ میں آئے اور لڑکوں کو تقریر سنا کر چلدئے اور باپ کی تعلیم یہ نہیں کہ الفاظ ادا کر دئے اور چلدئے بلکہ وہ سوچتا ہے کہ کون سے عنوان سے سمجھانا زیادہ مؤثر ہوگا وہ یہ بھی سوچے گا کہ آخر اتنے دن پڑھتے ہوگئے نفع کیوں نہیں ہوتا میں کونسی تدبیر اختیار کروں جو نفع ہو۔ کبھی ترغیب دیتا ہے کبھی ترہیب کرتا ہے۔ کبھی یہ سوچتا ہے کہ میرے کہنے کا اثر نہیں ہوتا تو لاؤ اسکے کسی دوست سے کہلواؤں۔ حق تعالیٰ کی تعلیم اسی رنگ کی ہے حالانکہ حق تعالیٰ کے غنا کو اگر دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ اُنکو کیا ضرورت ہے اسقدر اہتمام کی مگر کیا ٹھکانا ہے انکی شفقت کا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا کوئی بندہ ہم سے جدا رہے اور کیوں نہ ہو۔ انھوں ہی نے تو ان تمام شفقتوں کو پیدا کیا۔ بس جس نے باپ کے دل میں اتنی شفقت پیدا کردی وہ خود کیسا شفیق ہوگا۔ چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا۔ سبحان اللہ مشکل سے مشکل تعلیم کو

تعلیم باری تعالیٰ کی خصوصیت کا ذکر دو مثال سے

فرق تعلیم ماسٹر و باپ کی زیادہ شفقت میں

ف: غلام بننے کے کیا معنی بذریعہ حکایت

ف: حقیقت استخارہ

کیسا سہل کردیا ہے مقصود تو یہ تھا کہ عبادت کیا کرو یعنی غلام بنو اس غلام بننے پر ایک حکایت یاد آئی کانپور میں ایک بزرگ نقشبندی تھے اُن سے ایک طالب علم نے بیعت کی درخواست کی اُن بزرگ نے اُن سے کہا استخارہ کرلو اور اسکی ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ استخارہ میں یہ ضرورت نہیں کہ دعا پڑھ کے سو بھی رہے حدیث میں اسکا کہیں ذکر نہیں بلکہ اس رواج کی اصل یہ ہے کہ سونے میں ذرا یکسوئی زیادہ ہوتی ہے اسلئے یہی معمول ہوگیا ہے ورنہ سونا لازم نہیں حدیث میں صرف اتنا ہے کہ دو رکعت نماز پڑھکے دعا پڑھے اور یکسوئی کا منتظر رہے بس جو جانب قلب میں راجح ہوجاوے اُسپر عمل کرے چنانچہ انھوں نے وہاں سے ذرا ہٹ پھر واپس آ عرض کیا کہ میں نے استخارہ کرلیا اُن بزرگ نے کہا ایسا مختصر استخارہ کیسا کرلیا وہ کہنے لگے اُس استخارہ کو سن لیجیے میں نے الگ بیٹھکر نفس سے پوچھا کہ بیعت کے معنی فروخت شدن کے ہیں (یعنی بکنا) اور بکنے سے تو غلام ہوجاویگا۔ پھر غلام ہوجانیکے بعد اگر پیر بتادیگا کہ جاگو جاگنا پڑیگا اگر کہے گا کہ بھوکے رہو تو بھوکا مرنا ہوگا۔ اگر ٹھنڈا پانی پینے کو منع کریگا پیاسا رہنا ہوگا۔ مثلاً تو کیوں بیوقوف ہوا ہے کہ اچھی خاصی آزادی کو چھوڑ کر دوسرے کے قبضہ میں اپنے کو دیتا ہے نفس نے یہ جواب دیا کہ یہ سب کچھ سچ ہے مگر خدا تو ملیگا۔ میں نے کہا اگر خدا بھی نہ ملے تو کیونکہ وہ تیرا قرضدار تو نہیں تو اُس نے جواب دیا ؎

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے
پر تجکو چاہیئے کہ تگ و دو لگی رہے

بیعت کے معنی

وہ نہ ملے انکو اختیار ہے مگر انکو یہ تو خبر ہوجاویگی کہ یہ کمبخت بھی ہمارا طالب ہے بس اتنا ہی کافی ہے ؎

ہمینم بس کہ داند ماہرویم
کہ من نیز از خریداران اویم

ہمینم بس اگر کاسد قماشم
کہ من نیز از خریدارانش باشم

اُن بزرگ نے فرمایا بھائی تیرا استخارہ عجیب ہے اور بیعت کرلیا اور غلامی کی حقیقت تو بیعت سے بھی دشوار ہے۔ مگر حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر ہم ابتدا ہی سے یہ کہدینگے کہ اعبدہ یعنی اُسکی عبادت کرو تو نفس آمادہ نہوگا اسلئے حق تعالیٰ نے اُسکی تمہید میں اپنی ایک عظیم الشان صفت ارشاد فرمائی یعنی رب السموات الخ یہاں پر ہو مبتدا مقدر ہے اور رب السموات الخ اُسکی خبر ہے۔ اور اس نے جس صفت کی خبر دی ہے وہ صفت اعبدہ کو مقتضی ہے اور وہ صفت

رب السموات الخ [illegible]

مسلم تو اسکا اثر یہ ہوگا کہ اب نفس کو امتثال امر میں خلجان نہ رہیگا کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے صفات و کمالات بھی معلوم ہوگئے اور اسکا امر بھی معلوم ہوگیا اور یہ طبعی امر ہے کہ صاحب عظمت و کمال کی اطاعت طبعاً سہل ہوتی ہے۔ اور یوں تو حق تعالیٰ کے صفات کمال بیشمار ہیں مگر انکو فاعبدہ کی تسہیل میں اتنا بیّن دخل نہیں جتنا صفت ربوبیت کو کیونکہ محسن کی اطاعت کی طرف آدمی زیادہ دوڑتا ہے چنانچہ حکماء کی بھی اسپر نظر گئی ہے اور اسی لئے انکا قول ہے الانسان عبد الاحسان (انسان احسان کا بندہ ہے) اور یہ اقتضا صرف قولی ہی نہیں بلکہ عملی ہے کہ محسن کی تعظیم و تکریم صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً بھی کی جاتی ہے۔ کیونکہ احسان میں یہ اثر ہے کہ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور ربوبیت سماء و ارض سے بڑھکر کیا احسان ہوگا۔ اور اسی لئے ربکم یا ربک نہیں فرمایا بلکہ رب السموات والارض فرمایا اسواسطے کہ ربکم فرمانے سے یہ ہوتا کہ بعض صورتوں کو تو حق تعالیٰ کا احسان سمجھتے اور بعض کو نہ سمجھتے مثلاً اسکو تو احسان سمجھتے کہ جنگل میں بھوکے بیٹھے تھے کہ ایک خوان کھانے کا نازل ہوگیا مگر اسکو نہ سمجھتے کہ مثلاً پانچ سو روپیہ کی تنخواہ ہے اور اس سے اجناس خریدے گئے اور طرح طرح کے اسباب معیشت جہیا کئے گئے اور کھاپی رہے ہیں تو یہ ان وسائط کی ترتیب پر نظر کرکے یہ سمجھتا کہ میں نے ہی اسے پاس کیا تھا اُس ہی پانچ سو کی نوکری ملی اور اُس سے کھاپی رہے ہیں اسمیں کسی کا کیا دخل اور کیا احسان اور یہ مذہب مسلمان کا تو ہے نہیں قارون کا مذہب ہے کیونکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اُس سے فرمایا احسن کما احسن اللہ الیک (تو بھی خلق کی ساتھ احسان کر جیسا خدا نے تجھپر احسان کیا) تو اُس نے جواب دیا انما اوتیتہ علی علم عندی (کہ اور کچھ نہیں صرف یہی بات ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے میرے علم کی بدولت ملا ہے) اسمیں [illegible] کے احسان کو کیا دخل۔ (نعوذ باللہ) اسمیں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ علم کیا تھا ایک قول یہ ہے کہ کیمیا ہے کوئی کہتا ہے فن تجارت ہے غرض مختلف اقوال ہیں مگر چونکہ کسی کی تعیین دلیل صحیح سے نہیں اسلئے علم کو عام ہی رکھا جائے تو مناسب ہوگا خواہ وہ علم کیمیا ہو خواہ علم زراعت خواہ فن تجارت ہو خواہ سود لینا دینا ہو بہرحال کوئی تدبیر تھی ترقی مال کی جسکو اُس نے کہا علی علم عندی غرض وہ تو کافر تھا افسوس تو مسلمان پر ہے۔ ایک مسلمان صاحب جواب انتقال کرگئے ہیں وہ ہندوستانی

[illegible] سمجھنا مسلمان کا مذہب نہیں۔

[illegible]

ہو کر اُردو غلط بولنا فخر سمجھتے تھے چنانچہ آجکل یہ بھی ایک فیشن ہے کہ کوشش کرکے فخر یہ اُردو غلط بولتے ہیں تاکہ صاحبان بہادر سے تشبہ ہو چنانچہ میں نے ایک زباندان ہندوستانی کو بولتے سنا کہتا تھا کہ ...... ہم سننا نہیں مانگتا غرض وہ صاحب تھے مسلمان اُنکے سامنے کسی نے کہا انشاء اللہ ایسا ہوگا۔ کہنے لگا کمبخت اسمیں انشاء اللہ کا کیا بات ہے۔ یہ تو تدبیر کا بات ہے مگر انجام اُس شخص کا ایسا ہوا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو پھر کوئی بات بھی انشاء اللہ سے خالی نہ چھوڑتا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ نخاس کی طرف جارہے تھے کسی نے پوچھا کہاں جارہے ہو کہا گھوڑا خریدنے۔ کہا انشاء اللہ کہہ لو تو آپ کہتے ہیں اسمیں انشاء اللہ کی کیا بات ہے۔ روپے میری جیب میں اور گھوڑا نخاس میں۔ اتفاق سے راستہ میں کسی گرہ کٹ نے جیب کترکے روپے کی تھیلی غائب کر دی اب ناکام واپس آرہا تھا کہ راستہ میں اتفاق سے پھر وہی شخص ملگیا اُس نے پوچھا کہ کہو بھئی گھوڑا لائے کہنے لگا میں بازار جارہا تھا انشاء اللہ کسی نے روپے کی تھیلی چرالی انشاء اللہ میں ناکام واپس آرہا ہوں انشاء اللہ یا تو مستقبل پر بھی انشاء اللہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے یا اب ماضی پر بھی انشاء اللہ کہنے لگے۔ خدای تعالیٰ کبھی ان مغروروں کو ایسی زک پہنچاتے ہیں کہ دماغ سیدھا ہو جاتا ہے۔ سو آج کل بعض تو ربوبیت کے معتقد ہی نہیں بعض کو اگر ربوبیت کا اعتقاد بھی ہے تو حال نہیں ہے حال کی حقیقت ایک مثال سے سمجھئے کہ مثلاً سرکار عالی کسی کو ایک خوان بھیجدیں کہ اُسے دو تین وقت کھاوے تو بتائیے اُسوقت دل میں سرکار عالی کی ایک خاص طور کی یاد ہوگی یا نہیں اور خاص درجہ کی ممنونیت کا اثر ہوگا کہ نہیں اس کیفیت کو حال کہتے ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ رات دن خدا کے بھیجے ہوئے خوان استعمال کرتے ہیں یا نہیں تو کیا خدا کے ساتھ بھی یہی حالت ہوتی ہے یا نہیں ظاہر ہے کہ نہیں جسکی وجہ صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے خوان میں وسائط ایسے ہو گئے ہیں کہ اُن سے حق تعالیٰ تک نظر نہیں پہنچتی حالانکہ مثال مذکور میں بھی وسائط ہیں کہ سرکار عالی نے وزیر کو حکم دیا وزیر نے امیر کو امیر نے مشیر کو مشیر نے دبیر کو اور دبیر نے لاکر بشیر کو دیدیا تو وسائط یہاں بھی ہیں مگر پھر بھی ذی واسطہ پر فوراً نظر پہنچ جاتی ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ وسائط دو قسم کے ہوتے ہیں ایک یہ کہ بادشاہ نے تملیکاً وزیر کو دیا اور وزیر سے آخر تک سب نے دوسرں کو اسی طرح تملیکاً دیا پھر بشیر تک پہنچ گیا اور ایک یہ کہ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ یہ چیز فلاں

آجکل اعتقاد ربوبیت کا حال ہے۔

فلاں وسائط سے فلاں کو پہنچا دو تو پہلی صورت میں تو یہ وسائط فی العطا ہیں یعنی ہر ایک نے دوسرے کو عطا کیا اور دوسری صورت میں وہ وسائط فی الحکم ہیں تو اول قسم میں معطی اصلی تک نظر نہیں جاتی اور دوسری قسم میں جاتی ہے تو لوگ وسائط عطاء نعمت حق کو قسم اول سمجھ رہے ہیں حالانکہ بعد غور قسم ثانی کے وسائط ہیں۔ اب تو یہ شبہ رفع ہو گیا ہوگا کہ صاحب واسطوں کی وجہ سے حق تعالیٰ کا استحضار نہیں ہوتا۔ وجہ رفع یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا وہ آپ ہی کیلئے دیا اور جس شخص کے ذریعہ سے آپکو ملا وہ حقیقۃً مالک نہیں محض واسطہ فی الحکم ہے پھر بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں جہاں واسطہ قسم اول کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بارش سورج چاند ستارے یہ سب یقیناً آپ ہی کے نفع کیلئے ہیں اور انمیں کسی کا واسطہ نہیں ہے (قطعہ)

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
همہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

جب یہ حقیقت ہے تو اب کیا وجہ ہے منعم اصلی سے غافل ہونیکی صرف وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بعض عطاؤں کا ظہور آپ کے ہاتھ سے ہوا ہے مگر یہ نہ دیکھا کہ آسمان و زمین جسطرح خدا کے مسخر ہیں اسی طرح آپ بھی خدا کے مسخر ہیں تو آپکا ہاتھ بھی محض مسخر قدرت ہی ہوا پھر اسپر نظر پڑنا سبب غفلت کا کیوں ہو جاتا ہے دیکھیے میرا ہی ہاتھ ہے کہ آج کل اسمیں ایسا درد ہے کہ میں اپنی پیٹھ تک نہیں کھجلا سکتا۔ اگر یہ پورے طور سے میرا ہوتا تو میرے تابع ہوتا اگر انسان ذرا بھی سوچے سمجھے تو واقعات خود رہبری کرتے ہیں کہ گو ہمارے افعال اختیاریہ ہیں مگر خود اختیار ہی غیر اختیاری ہے پھر اسکو حجاب سمجھنا چہ معنی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ برے افعال پر سزا جائز نہ ہو کیونکہ اسکے بے غبار جواب ہمارے پاس یہ کافی ہے کہ وہ مالک ہیں انہیں اپنی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھنا فرض ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں جو کچھ کرتے ہیں اسی میں مصلحت ہوتی ہو باقی اسکے آگے ذات و صفات کی بحث چھڑ جاتی ہے جہاں کسی کی رسائی نہیں بقول حافظ رح ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں — کانجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

اور انہی کا قول ہے ؎

بحرے ست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست　　انجا جز انیکہ جان بسپارند چارہ نیست

غرض اسمیں کسی کی عقل کو رسائی نہیں ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبر و قدر کے مسئلہ میں خوض و بحث سے روکدیا ہے کسی ایسے ہی مسئلہ کے متعلق ایک بزرگ سے پوچھا گیا فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

جب گل و بلبل کے رموز ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں تو اسرار الٰہیہ کو کون سمجھ سکتا ہے اسی لئے کہا ہے ؎

حدیث مطرب مے گو و راز دہر کمتر جو　　کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

بہر حال مقصود یہ تھا کہ سب چیز حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے حتیٰ کہ حرکت و سکون بھی کہ جب تک انکی اجازت تھی ہاتھ ہلتا تھا اور اب اجازت نہیں ہے تو وہ پیچھ تک نہیں کھجلا سکتا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست　　میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم　　حملہ شاں از باد باشد دمبدم

قاعدہ ہے کہ پرچم میں اکثر شیر کی تصویر بنا دیتے ہیں کہ وہ جب ہوا سے ہلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ شان پیدا و ناپیدا است باد　　آنکہ ناپیدا است ہرگز کم مباد

دوسرے مصرعہ کی تفسیر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے فرمائی ہے اے از دل ما یعنی جو ذات ظاہر نہیں ہے ہمارے دل سے اسکا تصور ہرگز کم نہو۔ ورنہ اسکے ذات کے کم نہونیکی دعا کے کوئی معنی نہیں ؎

انت کالریح و نحن کالغبار　　یختفی الریح و غبراہ جہار

بس یہی حالت ہماری ہے ہم کیا اور ہمارا کمال ہی کیا۔ کہا جاتا ہے۔ فلاں بڑے صاحب ہیں۔ ارے ہمارا حساب ہی کیا اگر حق تعالیٰ چاہیں قلب کو بدلدیں بس سب بھول بھال جاویں تو بس یہ سارا انتظام حق سبحانہ ہی کر رہے ہیں اسواسطے وہ وسائط انکی معرفت میں کیوں حاجب ہوں۔ کچھ بھی نہیں محض ہماری غفلت ہے۔ اگر کوئی کہے حجازی کے بادشاہ کو تو ضرورت

ہوتی ہے وسائط کی حق تعالیٰ کو اسکی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر یہ نہوتے تو حجاب نہ ہوتا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم حکمت کے احاطہ کے مدعی نہیں لیکن تبرعاً اگر اتنا بتلا دیا جاوے تو مضائقہ بھی نہیں کہ حق تعالیٰ نے جو وسائط تجویز کیے ہیں وہ آپ کی تسلی کیلئے تجویز کیے ہیں چونکہ انہیں بندوں سے کمال محبت ہے اسلئے انکی راحت کیلئے وسائط کا انتظام کردیا کہ اگر تم جلا دو کھانا ہماری قدرت سے پک جاویگا۔ باقی طبخ طعام میں حقیقۃً آگ کا کچھ دخل نہیں حضرات صوفیہ کرام نے اسے خوب سمجھا ہے آپ اسکو ایک مثال سے سمجھئے کہ مثلاً سرخ جھنڈی ریل کے روکنے کیواسطے استعمال کیجاتی ہے اور سبز جھنڈی تیز کرنیکے واسطے۔ جو اسکی حقیقت جانتا ہو وہ سمجھتا ہے کہ اصل میں ڈرائیور چلاتا ہے اور وہی روکتا ہے اور جھنڈی محض ایک اصطلاحی علامت ہے اسکے چلانے یا روکنے کیلئے۔ اب دیکھنے والوں میں ایک تو انجنیر ہے جو انجن کے کل پرزوں کا ماہر ہے اور ایک دیہاتی گنوار ہے۔ دیہاتی تو یہ سمجھیگا کہ جھنڈی سے ریل رکتی ہے اور جھنڈی ہی سے چلتی ہے یہ گنوار اس کافر سائنس دان کے مشابہ ہے کہ جس نے خدا کو ایک منشی سے بھی کم کردیا ہے کہ وہ وسائط کو موثر حقیقی سمجھتا ہے اور خدا کو اگر مانتا بھی ہے تو بالکل بیکار سمجھتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ اور جو سائنس داں ذرا مسلمان ہے وہ خدا کو بیکار تو نہیں سمجھتا مگر وہ بھی اتنا ہی سمجھتا ہے کہ جیسے کوئی گھڑی میں کوک دیکے الگ ہوگیا۔ اب جسطرح کوک دینے کے بعد گھڑی کے افعال بغیر کوک دینے والے کی مدد کے جاری رہتے ہیں اُسی طرح اُن کے زعم میں عالم کی بھی حالت ہے کہ ایک بار اشیاء کو پیدا کرکے اور انمیں خواص ودیعت رکھکر پھر اُنکا کچھ دخل نہیں رہا باقی جو محققین اور مدققین ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر آن اور ہر شان میں خدا کے تصرف کی ضرورت ہے جسطرح سرخ جھنڈی کہ محض علامت واصطلاح ہے اسی طرح آگ بھی محض ایک علامت ہے باقی اثر اُسکا خاص تصرف حق سے ہوتا ہے اور اگر آگ موثر بالذات ہوتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اسکی تاثیر اسوقت کہاں گئی تھی جب ابراہیم علیہ السلام کو اسمیں ڈالا گیا تھا باقی قصہ میں کسی کو شبہ ہو تو خبر صادق سے ثابت ہے جسکا صدق قطعی ہے جسمیں مجال انکار نہیں اسی واقعہ کے مشابہ مولانا نے ایک حکایت تحریر فرمائی ہے کہ ایک بادشاہ لوگوں سے بت پرستی کراتا تھا جو انکار کرتا تھا اُسے ایک بڑے بھاری آگ کے حوض میں چھوڑ دیتا تھا چنانچہ ایک عورت سے کہا گیا اس نے انکار کیا اُسکے پاس ایک بچہ تھا اُس

بچے کو چھین کے آگ میں ڈالدیا قریب تھا کہ وہ عورت مبتلائے فتنہ ہوجاوے قدرت خدا سے وہ بچہ آگ میں
صحیح سالم اپنی ماں سے کہنے لگا ؎

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت — بانگ برزد طفل کانی لم امت
اندر آ اسرار ابراہیم بیں — کو درآتش یافت وردو یاسمیں

پھر تو ماں بھی کود پڑی اور جو بچہ کہتا تھا سبکو مخاطب کرکے وہ بھی کہنے لگی اب تو لوگ بھی لگے گرنے اور کوئی بھی نہ جلتا تھا جب یہ رنگ دیکھا تو بادشاہ بہت جھنجلایا اور آگ سے کہنے لگا
کہاں گئی تیری وہ تیزی اور حرارت تو جلاتی کیوں نہیں - آگ جواب دیتی ہے ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم — اندر آتا تو ببینی تابشم

یعنی میں آگ ہی ہوں تو آکے دیکھ لے کہ میں کیا ہوں مگر ؎

طبع من دیگر نگشت و عنصرم — تیغ حقم ہم بدستوری برم

یعنی خدا کی تلوار ہوں بغیر حکم کے نہیں کاٹ سکتی مولانا فرماتے ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند — با من و تو مردہ با حق زندہ اند

اور واقعی اگر زندہ نہوتے تو انمیں ادراک کیسے ہوتا اور ادراک نہوتا تو قلنا یا نار کونی برداً وسلاماً علی ابراہیم (یعنی ہمنے کہا اے آگ تو ابراہیم پر سرد اور سلامتی ہوجا اس) کے کیا معنی ہوتے چنانچہ فرشتوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ آگ کو سرد کردیں یا ابراہیم علیہ السلام کو بچالیں - بلکہ خود آگ کو خطاب کیا گیا - اور خطاب میں مجاز خلاف اصل ہے جسکی کوئی دلیل نہیں مفسرین نے اسکے متعلق لکھا ہی کہ اگر برداً کے بعد سلاماً کا لفظ نہوتا تو آگ برف بنجاتی اور اسوقت حضرت ابراہیم کو برودت کی اذیت ہوتی سلاماً فرمانے سے وہ بردوسلام ہوگئی تو یہ صاف دلیل ہے ان جمادات کے ذی شعور ہونے کی خیر یہ مسئلہ تو استطراداً آگیا اصل مضمون یہ تھا کہ کوئی چیز بالذات مؤثر نہیں محتاج ہیں تصرف حق کے پس کھانا پکنے کے نیچے آگ جلانے سے کھانا نہیں پکتا بلکہ پکانیوالے حقیقت میں وہی ہیں - لیکن اگر آگ جلانے کی اصطلاح نہوتی تو یہ پتہ نہ لگتا کہ اسوقت کس واسطے سے مقصود حاصل ہوگا اور یہ ایک بڑی مصیبت ہوتی پس آگ جلانا ایک حجاب ہے کھانا پکانے کی گو قولی دعا نہیں مگر حالی اور عملی دعا ہے - اسکی ایسی

مثال ہے کہ جیسے کسی نے بادشاہ کو سلام کیا اور اُس نے اُسے دس روپے دیدیے کہ سلام روستائی بغرض نیست - اسی طرح اگرچہ آگ جلانیوالا حق تعالیٰ کا منکر ہی ہو مگر وہ جب حالاً درخواست کرتا ہے کھانا پکا دیتے ہیں - اگر آگ نہوتی تو ضرورت کے وقت قولاً دعا کرنا پڑتی کہ اے اللہ کھانا پکا دیجئے مگر اس ہیں تسلی نہوتی کہ خدا جانے اس سے پکے گا بھی یا نہیں نیز درخواستوں میں تعارض ہوتا کہ ایک تو یہ درخواست کرتا کہ پکا دیجئے اور اُسکا پڑوسی یہ کہتا کہ کچا رہنے دیجئے - اسلئے ایک ایسا قاعدہ مقرر کر دیا جس نے تشویش سے بچا دیا - اس رعایت و شفقت کی قدر کی ہے صوفیہ کرام نے کہ ترک اسباب کی اجازت نہیں دیتے جیسے غلاۃ فی الزہد کرتے ہیں محققین کا مذہب یہی ہے کہ ایسا زاہد بے ادب ہے کمال اُن ہی حضرات کا ہے کہ انھوں نے زہد کو جمع کیا ہے اسباب کے ساتھ چنانچہ وہ کہتے ہیں سنسان جنگل میں بیٹھنا توکل میں جائز نہیں - گھر ہی بیٹھو اور دروازہ کھولکے بیٹھو مگر دروازہ کو دیکھو مت اسی کی نسبت غیر عارفین نے تنگ ہو کے کہدیا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ... باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

مگر یہ دشواری اُسکو ہے جو تیرنا نہیں جانتا اور جو تیرنا جانتے ہیں اور اُن کے دامن بھی اونچے ہیں وہ کھڑے ہو کر تیرتے ہیں اور دامن کو صاف بچا لیتے ہیں کیونکہ محققین ہمیشہ جامع بین الاضداد ہوتے ہیں - اسی واسطے اسباب کے استعمال کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور توجہ کا تعلق نہیں بھی رکھتے بہر حال یہ تو معلوم ہو گیا کہ وسائط برائے نام اسباب ہیں اور درحقیقت کرتے سب کچھ وہی ہیں ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ... مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اسواسطے فرمایا رب السموات والارض وما بینہما کہ سبکا مربی حق تعالیٰ ہے خواہ وہ آسمان ہو خواہ زمین خواہ انکے درمیان کی چیزیں ہوں اسمیں تمام اعیان و اغراض و اسباب آگئے تو تمام وسائط بھی انہیں کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو انکا کتنا بڑا احسان ہوا تو یہ بات رب السموات فرمانے سے حاصل ہوئی ربکم میں یہ حاصل نہ ہوتا کیونکہ اسمیں وسائط کا تخلل احسان تمام پر نظر نہ جانے دیتا اب اس تخلل کا بھی جواب ہو گیا کہ گو یہ وسائط ہیں مگر یہ سب بھی

بے اثر اور مربوب محض تو ان اسباب کے مسببات میں بھی وہی مربی ہیں آگے تفریع فرماتے ہیں فاعبدہ یعنی اس احسان کا مقتضا یہ ہے کہ اُن کے آگے غایت تذلل اختیار کرو۔ اور یہاں پر سموات کو جمع لانے اور ارض کو مفرد لانے میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ یہاں پر مناظرین کو ادب سکھایا گیا ہے کہ گو واقع میں سموات کی طرح ارض بھی متعدد ہیں مگر چونکہ وہ اس جگہ مقصود بالبحث نہیں اور اُن کے تعدد میں فلاسفہ کا اختلاف ہے اسلئے ہم نے اُسکے تعدد کی تصریح نہیں کی کہیں ایسا نہو کہ منکرین جو مقصود بالخطاب ہیں اسی بحث میں اُلجھنے لگیں اور مقصود رہجائے اسلئے ہم مقدمات مقصود کے ایسے لاتے ہیں جسمیں جھگڑا ہی نہ ہوسکے کیونکہ ارض کے وجود کا تو انکار کر ہی نہیں سکتے بس اسمیں مناظرین کو تعلیم ہے کہ مخالف سے کلام کرنے کے وقت ان امور کا لحاظ رکھا کرو مگر ہم لوگوں نے ان آداب کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب تو بحث میں زوائد ایسے لاتے ہیں کہ اُنمیں اتنا جھگڑا بڑھ جاتا ہے کہ مقصود کا وقت ہی نہیں آنے پاتا۔ بہرحال فاعبدہ میں حکم ہے کہ غلام بنجاؤ۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ ہم لوگوں میں ایسے حیلہ جو اور بہانہ باز بھی ہیں کہ صرف فاعبدہ سنکے ایک مرتبہ نماز پڑھ لینے ہی کو یہ سمجھتے کہ بس امتثال امر ہوگیا اسلئے آگے فرماتے ہیں واصطبر لعبادتہ یعنی اپنی غلامی پر مداومت رکھو پس ایک درجہ غلام بننے کا ہے اور دوسرا درجہ غلامی پر قائم رہنے کا اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ تتمہ ہے باسبق کا تاکہ کوئی یوں نہ سمجھ سکے کہ فقط غلام ہونا مقصود تھا غلام رہنا مقصود نہ تھا بلکہ غلام بننے کے بعد پھر اللہ میاں نے آزاد کر دیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر واقع میں بھی آزاد کر دیتے تو کیا اُس کے یہ معنی ہوتے کہ اعتقہ اللہ من رق یعنی خدا نے غلامی سے آزاد کر دیا۔ یا یہ معنی ہوتے کہ اعتقہ اللہ من النار یعنی خدا نے عذاب دوزخ سے آزاد کر دیا جیسے آقا اپنے غلام کا بدل جنایت ادا کرکے اُسکو سلاسل و اغلال سے آزاد کرا دے سو ظاہر ہے کہ یہ معنی تو ہونا محال ہی ہے کہ اُس نے اپنی غلامی سے بھی آزاد کر دیا چنانچہ استحالہ اسکا ظاہر ہے مخلوق و مربوب کے لئے مملوک و محکوم ہونا لازم عقلی ہے جب یہ آزادی محال ہے تو ظاہر ہے کہ غلام رہنا واجب ہے تو اگر واصطبر بھی نہوتا تب بھی اُسکے معنی کا تحقق واجب تھا اور یہاں سے حریت کی بھی تحقیق معلوم ہوسکتی ہے جس کی تمام دنیا میں ہلچل ہے اور اُسکو مذہبی و فطرتی حق ٹھیرایا

نکتہ جمع سموات و افراد ارض

حریت انسان کا فطرتی حق ہے

جاتا ہے تو سمجھ لیجے کہ وہ حریت کونسی آزادی ہے آیا اس حریت کے معنی غیر حق سے آزاد ہونا ہے یا حق سے آزاد ہونا واقع میں حق کی غلامی ہی میں ہمارا فخر ہے نہ آزادی میں چنانچہ جنکو اس غلامی کی حقیقت کا مزہ آگیا ہے وہ کہتے ہیں ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند ۔۔۔ شکارش نجوید خلاص از کمند

اسکو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک عاشق ہے جسکو معشوق کبھی منہ بھی نہیں لگاتا تھا اتفاق سے ایک مرتبہ وہ اسکو کہیں راستہ میں ملگیا اور اس نے عاشق کو اس زور سے دبوچا کہ ایک پہلو کی پسلیاں دوسرے پہلو سے ملگئیں اور یہ معلوم ہونے لگا کہ اب دم گھٹکر نکلجائیگا اس حالت میں محبوب پوچھتا ہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو تمکو چھوڑ دوں اور کسی دوسرے عاشق کو اسی طرح دباؤں تو یہ اسوقت بھی کہیگا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی اس دبوچنے میں تو اگر مر بھی جاؤں تو میری عین سعادت ہے اسی طرح جو محبین خدا کی عبادت میں مقید ہیں اور یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ انھیں اسمیں تکلیف بھی ہے اگرچہ اسے تو وہی جانتے ہیں کہ تکلیف ہے یا راحت مگر میں علی سبیل التنزل کہتا ہوں کہ فرض کرلیا جائے کہ تکلیف ہی ہے تو وہ تکلیف ایسی ہی ہے جیسے مثال مذکور میں ۔ اور یہ بات خدا کی محبت سے پیدا ہوتی ہے محبت پیدا کرو اس سے معلوم ہوگا اب یہ بات کہ محبت کیسے پیدا کریں سو وہ محبت بھی اس غلامی ہی سے پیدا ہوگی اور اسکی صورت یہ ہوگی کہ اول اہتمام عبادت سے بہ تکلف محب کی صورت بنایئے پھر انشاء اللہ حقیقی محبت بھی پیدا ہوجائیگی بس یہی طریق ہے جو اپنے کرنے سے ہوگا نہ پیر کی توجہ سے ہوگا نہ فقیر کے تعویذ گنڈوں سے ہوگا ۔ ہاں یہ خدا کی موہبت ہے کہ وہ ہادی برحق تک پہونچا دیں اسمیں ہمارا زیادہ دخل نہیں ۔ بہرحال قاعدہ کی ساتھ واصطبر لعبادتہ کا بھی ارشاد ہے یعنی اسکی عبادت پر دوام کرو ۔ اور ہمیشہ کیلئے پابند بنجاؤ ۔ اب آگے بطور مزید تاکید کے فرماتے ہیں یا یوں کہئے کہ کسی امر کیلئے جسطرح کوئی امر مقتضی ہوتا ہے اسیطرح کبھی کوئی امر مانع بھی ہوتا ہے تو پہلے رب السموات میں مقتضی کا ذکر کرچکے اب آگے مانع کو مرتفع فرماتے ہیں کہ ھل تعلم لہ سمیا تم اسکا کوئی مثل یا ہمنام بھی جانتے ہو یعنی جب خدا کا مثل یا ہمنام تک تمھارے علم میں نہیں

تو اس سے کیوں اعراض کرتے ہو یہ تاکید تو اسطرح ہے کہ جب وہ بے مثل ہے تو نہایت اطاعت کا
مستحق بھی وہی ہے اور رفع مانع اسطرح ہے کہ اسکی عبادت کا مانع یہ ہو سکتا تھا کہ دوسرا کوئی ایسا
ہی ہوتا تو پھر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی عبادت کیوں نکریں اب یہ مانع بھی متحقق نہیں اور
اسمیں دوسری تفسیر پر ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اسکی ہستی ایسی یکتا ہے کہ مسمی میں تو کون
شریک ہوتا اسم میں بھی اسکا کوئی شریک نہیں ہوا چنانچہ آج تک دنیا بھر میں اللہ کسی کا نام نہیں
ہوا۔ رحمان تو بعض نے اپنا نام رکھلیا تھا چنانچہ مسیلمہ کو اسکے معتقد رحمان الیمامہ کہا کرتے
تھے مگر اللہ نام کسی نے بھی نہیں رکھا۔ اگر کوئی کہے کہ اچھا ہم اب رکھدینگے تو اسکا جواب
یہ ہے کہ جسوقت اس ھل تعلم کا نزول ہوا ہے اسوقت تو نہیں تھا اب رکھنے سے آیت
کا معارضہ لازم نہیں آتا۔ اور یہاں سے اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا کہ قرآن میں ہے۔
ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ (خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے)
اور اخبار میں چھپا تھا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل تھے۔ جواب کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالےٰ
نے ماضی کا صیغہ اختیار کیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ وقت تکلم سے زمانہ گزشتہ میں خدا نے
ایک سینہ میں دو دل نہیں بنائے اور آیندہ کے متعلق نفی سے سکوت ہے۔ بہرحال مقصود
یہ ہے کہ جب وہ ہستی ایسی یکتا ہے تو پھر اسکی عبادت کے ترک کی کیا وجہ اس مقصود کے لئے
ارشاد فرمایا ھل تعلم لہ سمیا اور اس عنوان میں ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے کہ
کوئی خدا کا ہمنام ہو مگر ہمیں اسکی خبر نہو تو عدم العلم سے علم العدم تو لازم نہیں آتا اور مقصود موقوف
ہے علم العدم پر تو یہ جملہ مقصود کے لئے کافی نہ ہوا جواب یہ ہے کہ یہ عنوان قانونی نہیں ہے
یہ محض آپ کی شفقت کیواسطے اختیار کیا گیا ہے کہ بفرض محال اگر کوئی ہمنام ہو بھی تو اے
مخاطب جب تجھے اسکی خبر نہیں تو تجھے تو اپنے علم کا پابند ہونا چاہئے تو پھر اعراض عن العبادۃ
چہ معنی اگر یہ عنوان نہ اختیار کرتے تو یہاں بھی ایک مناظرہ کا مسئلہ چھڑ جاتا کہ اسکی کیا دلیل
ہے کہ کوئی خدا کا ہمنام نہیں۔ اور اس سے وہی خرابی لازم آتی جو ارض کے جمع لانے میں مذکور
ہوئی کیونکہ یہ مقدمہ مقصود ہے اسکی کاوش سے مقصود کی طرف توجہ نہ رہتی اسلئے صورت
مناظرہ کو بچایا ہے اور یہ کمال بلاغت ہے کہ مقدمہ مقصود کو خدشہ سے بھی محفوظ رکھکر

مقصود تک پہنچا دیا۔ بہر حال یہ تو نکات ہیں مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے غلامی کی تعلیم دی ہے۔ بس ہمیں غلام بننا چاہئے اب آگے غلامی کی تفریعات رہگئیں کہ غلام کرتا کیا ہے سو وہ تفریعات گو اس مقام پر مذکور نہیں مگر ہر شخص عقل سے معلوم کر سکتا ہے چنانچہ میں انکو مختصراً بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔ غلام یہ کرتا ہے کہ اپنے آقا پر کامل اعتماد رکھتا ہے اُسے اپنا پشت و پناہ سمجھتا ہے آقا اسکے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اور آقا پر اُسکے بھروسہ کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ خواہ کیسا ہی قحط ہو اور اُسمیں اگرچہ آقا بھی فکر مند ہو مگر اُسے یہ سمجھکر مطلق فکر نہیں ہوتی کہ ہمارا آقا موجود ہے اُسے خود ہمارا خیال ہے۔ اگر آقا صاحب قدرت ہوتا ہے تو غلام بھی اُسکی بھروسہ دلیر ہوتا ہے کسی مخالف سے ڈرتا نہیں اور اُسکے قلب میں آقا کی عظمت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اسکے احکام بغیر لم اور کیف کے بجا لاتا ہے اور اس سے کسی خدمت کا عوض نہیں پوچھتا۔ اور آقا اُسمیں جو تصرف کرے اُسپر ذرا چون وچرا نہیں کرتا۔ آقا کو کبھی گھر کی صفائی مقصود ہوتی ہے تو غلام کو بھنگی کا لباس پہناتا ہے تو یہ اُسمیں بھی خوش ہے اور کبھی کہیں بجائے اپنے دعوت میں بھیجتا ہے تو اپنا لباس پہناتا ہے تو یہ اُسمیں بھی خوش غرض ہر حال میں اُسکا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

بس حق تعالیٰ کی غلامی میں ہمارا یہی مذہب ہونا چاہئے۔ بس اب آپ اس مختصر کو اپنے تمام احوال میں پھیلا لیجئے اور ہر حال میں یہ دیکھ لیجئے کہ ہم مقتضائے غلامی سے خلاف تو نہیں کر رہے ہیں۔ اب میں ختم کر چکا۔ حق تعالیٰ سے علم و عمل اور توفیق غلامی کی دعا کیجئے فقط دعا

تمام شد